خوابِ سفر

(ناول)

امان اللہ خان

"بے خواب سفر" کا مطالعہ کرتے ہوئے جو بات سب سے پہلے اور نمایاں ترین محسوس ہوتی ہے وہ ان کہانیوں کے کردار اور ان کی معاشرت ہے۔ یہ کردار دیہاتی، قصباتی ہوں یا شہری، ان کا تعلق بالعموم نچلے یا نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ چوں کہ ہماری آبادی کا بیش تر حصہ ان ہی طبقات پر مشتمل ہے اس لیے ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہانیاں پاکستان کے غریب عوام اور گرے پڑے لوگوں کی معاشرت، مشکلات اور بے تعبیر خوابوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کہانی کار نے نہایت دردمندی اور سچائی کے ساتھ عام لوگوں کے دکھوں کو سمجھنے اور پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ ناکام کہیں نہیں ہوئے۔ اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ان کرداروں کو مصنف نے یا تو قریب سے دیکھا یا خود ان کا حصہ رہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ انھوں نے ان واقعات کی پیش کش میں حقیقت کا ایسا رنگ بھرا ہے کہ وہ فرضی اور بناوٹی قطعاً نہیں، حقیقی اور سچے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان پر بِیتی کا گمان ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ خان نے نئے پرانے افسانوی ادب کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے جس سے انھوں نے کہانی کاری کے رموز ہی نہیں، اپنی کہانیوں میں تاثیر پیدا کرنے کا ہنر بھی سیکھا ہے۔ ان کا اسلوب بیان سادہ مگر دلکش ہے۔ زبان معیاری اور اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے ان کی کہانیاں اردو ادب کے قارئین میں پسند کی جائیں گی اور یقیناً یاد بھی رکھی جائیں گی۔

منشا یاد

بے خواب سفر

(افسانے)

امان اللہ خان

(افسانے)

رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

اشاعت : 2012ء

کتاب : بے خواب سفر (افسانے)

مصنف : امان اللہ خان

ناشر : محمد عابد

تزئین : عبدالحفیظ

قیمت : 250 روپے

مطبع : B.P.H پرنٹرز، لاہور

Bey Khwab Safar

by

Aman Ullah Khan

Edition - 2012

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، جھنگ محلہ امین پور بازار فیصل آباد
Cell: 0300-7980300
E-mail:misalkitabghar@gmail.com

علی،

حمزہ،

ابوذر،

اقراء،

اور ان کی ماں

کے نام

ترتیب

بے خواب سفر اور دوسرے افسانے

امان اللہ خان کی اس کہانی ''بے خواب سفر'' نے اور ان کی رستم والی کہانی نے اور گولڈ میڈلسٹ عبداللہ خان کا جو قصہ انھوں نے سنایا ہے اس نے اور کہانی ''مختاری'' نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

یہ تو ایک سے زیادہ کہانیاں ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر کسی کہانی کار نے آپ کو ایک کہانی بھی ایسی دے دی ہو جو پڑھ چکنے پر آپ کو بے چین رکھے اور آپ کے ساتھ ساتھ لگی چلی آئے تو آپ اس کہانی کار کو تلاش کر کے پڑھیے۔ اس کے لیے دعائے خیر کیجیے کہ وہ لکھتا رہے اور اس من موہنی زبان اردو کو پُرمایہ کرتا رہے...... کیوں کہ زبان بھی اور ہم اردو لکھنے پڑھنے والے بھی مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ میں اس بارے میں یہاں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ مجھے تو اوپر بیان کی گئی ایک کہانی پر آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

بے خواب سفر کے بارے میں عرض ہے کہ یہ کسی پہاڑی ریلوے سٹیشن پر تعینات ٹرالی دھکیلنے والے کے بیٹے کی زبان سے سنائی گئی کہانی ہے۔ اسے اس کا باپ ٹھیلے کی گدی والی سیٹ پر بیٹھے ریلوے افسر جیسا کامیاب آدمی بنانا چاہتا ہے۔ گرے سفاری سوٹ میں ملبوس، سولا ہیٹ اور چمک دار جوتے پہنے...... ایک کامیاب آدمی۔

یہ کہانی محرومی کا اور اس سے پیدا ہونے والی مایوسی کا سیدھا سچا احوال سناتی ہے۔

تین آدمیوں باپ، ماں اور بیٹے کے ساتھ ہونے والے حادثوں سے ترتیب دی گئی

اس کہانی میں باپ اور ماں بڑی نیک نیتی اور ضدی پن کے ساتھ اپنے بیٹے کی زندگی بنانے اور گھرانے کو غربت اور مایوسیوں کے گڑھے سے نکالنے کے لیے ہر دن، ہر روز ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال سخت محنت کی ٹھنڈی پٹڑی پر دوڑتے رہتے ہیں، دوڑتے رہتے ہیں اور بالآخر ہار جاتے ہیں۔

میں نے ایسی Depressing مگر Captivating کہانیاں کم ہی پڑھی ہیں۔ مجھے (تمام دنیا والوں کی طرح) ہار جانے والوں کے بارے میں کچھ زیادہ جاننا اچھا نہیں لگتا مگر ہمارے کہانی کار امان اللہ خان نے پلاٹ کی بنت میں ایسا کچھ ڈال دیا ہے کہ کہانی ختم ہوتے ہوتے پڑھنے والے کو حوصلے کی ایک کرن بہر حال دکھائی دے جاتی ہے۔ جی ہاں ٹرالی کی گدے دار سیٹ پر بیٹھنے والا نقوی صاحب خوابوں کی ایک گٹھڑی باندھ کر اس لڑکے کے حوالے کرتا ہے اور چلتے رہنے اور محنت کی پٹڑی پہ دوڑتے رہنے پہ لگا دیتا ہے۔ بس اتنی سی بات اور یہی ذرا سی بات کہانی کے سفر میں کہانی آخر ہوتے ہوتے پڑھنے والے کو حوصلہ دے جاتی ہے۔ ویسے تو کہانی کار نے لکھا ہے کہ بیٹا باپ کے پتھریلے پاؤں پہن کر ٹھیلے کی ہتھی تھام کر ٹریک کے بے خواب سفر پر روانہ ہو جاتا ہے پر ہم جانتے ہیں یہ سفر بے خواب نہیں ہے۔ ہمارے حسابوں اور اُمید کی ایک زرد (مگر دکھائی دیتی) ناتواں کرن بہر حال اس سفر میں لڑکے کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ پڑھنے والے کو بین السطور معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکا ہارا نہیں ہے ...... اور یہی ان کہانی کار خان صاحب کی فن کاری ہے۔ میں خود motivational کہانیوں اور ''ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے'' جیسی شاعری کی پروردہ نسل سے ہوں۔ جب میں کہانیاں پڑھنا سیکھ رہا تھا تو کرشن چندر کو بہر حال پڑھتا تھا۔ کرشن چندر نے کتنی ہی ناقابلِ فراموش کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کا ایک کردار (کہانی کا نام یاد نہیں) اپنے اس بیٹے سے ...... جو جدوجہد کرتے، حالات سے لڑتے، قدم قدم بڑھتے، پھسلتے گرتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ غصے میں ایک بے ڈھب تقریباً Comic فقرہ کہتا ہے یہ فقرہ مجھے نصف صدی کے پھیلاؤ میں بھی یاد رہ گیا ہے۔ باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے تو

کب تک قدم قدم چلتا رہے گا؟ ارے ایک ہی جست میں منزل کو پا لے سالے!

یہ فقرہ میں نے آپ کی تفنن طبع کے لیے Quote نہیں کیا ہے ترقی پسند دوست عوام الناس کو motivate کرنے کو کرداروں سے یہ سب بھی کہلواتے تھے۔

مگر ان کا زمانہ ہمارے زمانے سے کہیں زیادہ آسان تھا۔

دنیا اس وقت unipolar نہیں تھی کہ جیسا بھی تھا ایک سرخ یا کسی بھی رنگ کا سویرا، دنیا کے پسے پچھڑے ہوؤں کی نظر میں رہتا تھا۔ کسی گلوبل ولیج کے کنزیومرازم، اشتہاری کلچر، مارکیٹ اکانومی اور آئی ایم ایف اس وقت تک سامنے نہیں آئے تھے۔

ہم تو کرشن چندر کے دور سے کہیں زیادہ Depressing دور سے گزر رہے ہیں ...... زیادہ بھیانک جغرافیے میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم سب تو بے دلی اور عیاری سے کی گئی دو تین زرعی اصلاحات، نواب زادوں اور امیر زادوں کے کابوس کے زیر سایہ ہیں اور کتنے ہی مخدوم زادوں سے منسوب بے شمار جاگیرداریوں اور لوٹ مار کے نظاموں کی گرفت میں ہیں۔ جست وست لگانے پر کسی کو اکسایا بھی نہیں جا سکتا۔ نشرواشاعت کی نگرانی کرنے والے بیوروکریٹ اگر نہ بھی پکڑیں تو سوال یہ ہے کہ ادبی کہانیاں ہمارے کتنے لوگ پڑھتے ہیں۔ یہاں کتنے فی صد لوگ خواندہ ہیں۔ کیا اگلے پچاس ساٹھ برسوں میں گاؤں گاؤں پرائمری سکول کھلنے کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں یا نہیں۔

ہم تو بس یہ کر سکتے ہیں کہ خوابوں کی ایک گٹھڑی سنبھالے رہیں اور اپنے اپنے ٹریک پر حوصلے سے دوڑتے رہیں شاید اس طرح ہم کوئی منزل (جو ابھی واضح بھی نہیں) پا سکیں گے۔

یہ کہانی کار اور یہ خاکسار اور ہم ایسے کتنے ہی خواب پالنے والے اس وقت اس طرح سوچ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ ہماری خوش فہمی ہو اور ڈیپریشن کی شاید ایک ڈیڑھ صدی ابھی اور ہماری نسلوں کے سروں پر سے گزر جائے۔ پھر بھی ہمیں خواب دیکھتے رہنا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ سانس لینے جیسا ہے۔

اسد محمد خان

پیش لفظ

ٹین کے زنگ آلود بکسے میں برسوں سے رکھے پیتل نکل اور چاندی کے سکے......
کتابوں، رسالوں سے کٹی ہوئی تصویریں...... کانچ کی گولیاں، مٹی کے کچھ ٹوٹے ہوئے کھلونے...... پیتل کی سیٹی، زنجیر والی ایک پرانی West end کی رومن ہندسوں والی جیبی گھڑی...... پرانی چابیوں کا ایک گچھا...... کچھ اور بھی بے نام سی چیزیں......

...... کبھی کبھی میں یہ باکس کھول لیتا ہوں اور یادوں کی پاتال میں اُتر جاتا ہوں۔
وقت کے دھول بھرے راستوں پر اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتا ہوا اُس بڑی حویلی کا دروازہ کھول لیتا ہوں جس کے وسیع صحن کی گود میں مَیں نے اپنے بچپنے کو کھیلتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا...... ایک بڑی سی حویلی، جس کے شرق اور غرب میں دو بڑے دروازے تھے اُن کا درمیانی فاصلہ میری عمر سے بہت زیادہ تھا۔ میں کبھی بھی دوڑ کر ایک سانس میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک بغیر رُکے ہاتھ نہ لگا سکتا تھا...... کمروں کے اُگے ہوئے اس جنگل میں ایک عجیب سناٹا تھا جو کبھی کبھی بے آواز سسکیوں سے رویا کرتا تھا...... گھر میں چپ جیسی میری ماں تھی مگر نہیں تھی۔ گھر کے کمروں میں بنی ہوئی، ادھوری سی...... تنہائی تھی......
مَیں تھا اور صرف مَیں تھا۔ مٹی کے کھلونے لے کر کمرے کے کونے میں سارا دن اُن سے کھیلتا رہتا، اُن سے باتیں کرتا اور ان کی طرف سے جواب بھی خود ہی دیتا۔ باپ منہ اندھیرے اپنے لکڑیوں کے ٹال پہ چلا جاتا۔ رات دیر سے واپس آتا۔ رشتے کی تجدید کے

لیے چہرے پہ بوسہ ثبت کر جاتا اور میں اپنے چہرے پر مونچھوں کی ایک خوش گوار سی چبھن کو محسوس کرتا۔ ایسے میں میں اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیتا۔ اور یوں یہ رشتہ بھی استوار رہتا۔

ماں کے پاس شاید محبت کے جذبے تھے ہی نہیں۔ اگر کچھ تھے تو انھیں کہیں چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ ماں کی دو باتیں مجھے بہت ناگوار گزرتیں۔ ہفتے میں جب وہ ایک بار مجھے لکڑی کی چوکی پر ننگا بٹھا کر گرم یا ٹھنڈے پانی سے نہلایا کرتیں۔ صابن کی جھاگ سے مجھے لپیٹ دیتیں۔ اور پھر ایک کھردرے پتھر سے میرے پاؤں کی میل اتارتیں۔ میں صابن کی جھاگ کی جلن سے ڈر کر آنکھیں بند کیے مجبوراً یہ اذیت اٹھاتا رہتا۔ دوسرا ماں کو مجھے پڑھانے کا بہت کریز تھا۔ وہ گاؤں کے گرلز سکول کی پرائمری پاس تھیں۔ مجھے قاعدہ تھما کر پیڑھی پہ بٹھا دیتیں اور میں اُونچی آواز سے قاعدے کا سبق دُہراتا۔ اونچے سُروں میں گنتی گاتا رہتا، اور وہ کمروں میں گم اپنی سماعتوں کی بینائی سے مجھ پر نظر رکھتیں۔

ایک روز ماموں مجھے اٹھا کر سکول لے گئے۔ ہیڈ ماسٹر نے کم سنی کی وجہ سے داخلہ دینے سے انکار کر دیا اور مزید دو سال انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر ماں اتنا انتظار کب کر سکتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو میرے پہلے جنم دن پر ہی مجھے سکول داخل کرا آتیں۔ وہ مجھے لڑکیوں کے سکول لے گئیں جو کہ پرانی حویلی میں آباد تھا۔ سکول ہی میں رہائش پذیر ایک بیوہ خاتون سکول انچارج تھی جو کہ میری ماں کی بھی استاد رہ چکی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں اس کام میں اس کی معاونت کرتیں۔ یوں ایک ہی گھرانے کے زیرِ سایہ یہ سکول خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ داخلہ کیا ملنا تھا مجھے سکول ہی میں رکھ لیا گیا۔ وہ ماں جو مجھے قاعدہ پڑھاتے ہوئے، نہلاتے ہوئے اپنے سارے جذبے پوٹلی میں باندھ کر اپنے وجود سے الگ رکھ لیا کرتی تھی اپنے آپ کو نہ سمیٹ سکی۔ اداس چہرے اور بھیگی آنکھوں کو چادر میں چھپائے مجھے باجیوں کے پاس چھوڑ کر گھر چلی گئی...... ماں کے بارے میں میرے تحفظات بجا، مجھے اس مختصر زندگی میں ماں سے جدا ہونے کی تلخی تو نبے کے زہر کی طرح حلق سے اترتی ہوئی محسوس

ہوئی۔ "ماں مجھے کیوں چھوڑ کر چلی گئی۔"

یوں میں نے تختیِ حیات پر دکھ کی پہلی کہانی لکھی۔ پھر زندگی بھر اس تختی سے وہ روشنائی نہ مٹ سکی...... دکھ...... جدائی...... آنسو...... نارسائی...... ہیروئنچی کی طرح میں اس زہر کا عادی ہو گیا اور یہ زہر مجھے ایک روز مار ڈالے گا۔ لیکن یہ میری مجبوری بن گئی ہے جب تک میں اس کا ٹوٹا نہ لگا لوں اس حیاتی میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے دوست معترض ہیں کہ میں لفظوں اور جملوں کی چینی چڑھا کر معصوم ذہنوں میں زہر بانٹتا پھر رہا ہوں اور یوں میں ایک مجرمانہ فعل کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

بات کچھ اور کر رہا تھا۔ مکالمے کا دھاگا ٹوٹ جائے تو بات کہاں سے کہاں جا گرتی ہے۔ ٹوٹا ہوا سرا ڈھونڈ کر گانٹھ لگاتا ہوں تو سکول واپس آ جاتا ہوں جہاں نصرت اور صدیقہ باجی نے لالٹین کی بتی پر سوئی گرم کر کے پہلے روز ہی میرے دونوں کان چھید ڈالے تھے۔ سوراخ میں اون کا نیلا دھاگا ڈال دیا گیا۔ زخم ٹھیک ہوا تو دونوں نے اپنے اپنے حصے کی ایک ایک سونے کی بالی میرے کانوں میں آویزاں کر دی اور یوں اپنی محبت کو برابر بانٹ لیا۔

"ماں تمھارے جیسے ہمارے دو جڑواں بھائی تھے...... ایک ٹائیفائیڈ سے ایسا ٹوٹا کہ بالکل بکھر گیا۔ دوسرا گاؤں کے تالاب میں ڈوب گیا۔"

"تم دونوں کو بھائی راس نہیں آتے۔" اس کے بعد ماں نے کسی بیٹے کو جنم نہیں دیا۔

صدیقہ خاموش ہو گئی تو نصرت کی آنکھیں بولنے لگیں۔ بھیگے بھیگے ٹوٹے ٹوٹے موتیوں سے میری جھولی بھر گئی۔ انھوں نے اپنی ساری محبتیں مجھ پہ نچھاور کر دیں۔ ہر وقت مجھے بنانے سنوارنے میں لگی رہتیں۔ میرے بال لڑکیوں کی طرح کاٹ دیے گئے۔ آنکھوں میں سرمہ، ناخنوں پہ نیل پالش...... ہونٹوں پہ سرخی لگا دی گئی۔ غرارہ، لاچا اور ان سے میچ کرتے سینڈل...... سرخ و سبز کانچ کی چوڑیاں دائیں بائیں بازوؤں میں پہنا دی گئیں۔

محبت کے اس بہتے دریا میں میں ڈوب گیا۔ میری ماں مجھے ڈھونڈنے نکلی تو

اسے میں کہیں نہ ملا...... دو سال بعد میری لاش کنارے لگی۔ میری ماں میرے کھو کھلے وجود کو گھر لے گئی مگر میں اس میں موجود نہیں تھا، سکول کے کونوں کھدروں میں کہیں لٹکا ہوا تھا۔ صدیقہ باجی کے پلنگ کے نیچے یا نصرت باجی کے آنچل کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ یوں میں اس گھر سے بے گھر ہو کر اپنے باپ کی حویلی آ گیا۔ پہلے تختی پہ دکھ کی ایک کہانی لکھی تھی اب کے کاغذ قلم سے پیار کی ایک کہانی لکھی۔ اس کاغذ کو تہ کر کے یادوں کے بکسے میں ڈال دیا۔

میرے لمبے لمبے بال کاٹ دیے گئے۔ چوڑیاں اور بالیاں اتار دی گئیں۔ لڑکیوں کے لباس کی جگہ ملیشیے کی شلوار قمیض پہنا دی گئی۔ ماں میرا دکھ سمجھتی تھی۔ اس نے میری محبت کے سارے حوالے میرے کھلونوں کے بکسے میں ڈال دیے۔

سوکا اپنے کناروں سے باہر چھلک رہا تھا۔ نالے کے اس پار گاؤں میں ایک شور تھا۔ نعرے تھے، جلوس تھا۔ پاکستان وجود میں آ گیا تھا۔ گو مجھے اس کا مکمل شعور نہیں تھا مگر وہ عجیب بے شعور خوشی تھی۔ کاغذ کی ایک سبز جھنڈی جس پر ماں نے چاند تارا لکھ دیا تھا اس جھنڈی کو لیے ڈھکی پر کھڑا نعرے لگا تا رہا۔ پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد۔ شام اتر آئی اور روشنی کو سمیٹ کر افق پہ لے گئی۔ آسمانوں سے ایک نور اترا۔ اس سرزمین کو روشن کر گیا اور یہی نور میرے اندر اتر گیا۔ میرے قلم اور میری روشنائی میں پھیل گیا۔

لڑکوں کے سکول جانے لگا۔ واپسی پہ لمبا راستہ طے کر کے ان گلیوں سے گزرتا ہوا جاتا جو باجیوں کے سکول کو جاتی تھیں...... دروازے پہ دستک دیتا۔ اندر ایک شور مچ جاتا۔ مانی آ گیا ہے۔ مانی آ گیا ہے۔ ایک روز اپنے سکول سے چھٹی کے بعد باجیوں کے سکول گیا۔ طبیعت کچھ خراب تھی۔ بخار تیز ہو گیا۔ گھر جب واپس نہ پہنچا تو ماں نے مجھے پورے گاؤں میں ڈھونڈا۔ جب مجھے سکول میں پایا تو اس روز کے بعد وہ دروازے بھی مانی کے لیے بند کر دیے گئے۔

''مانی بھی اچھی طرح نہیں پڑھ سکے گا۔ نصرت اور صدیقہ بھی ہر وقت مانی کے

دھیان میں رہتی ہیں۔ اب اس رسی کو کاٹ ہی دینا چاہیے۔"

کنیز فاطمہ جو دو بیٹوں اور اپنے میاں کی جدائی کا دکھ بڑھاپے کی پیٹھ پہ لادے اپنی بیٹیوں کے لیے جی رہی تھی کوئی نیا روگ پالنے کے لیے تیار نہ تھی۔

میرا اسکول کیا تھا...... گنتی تھی۔ تین سو پینسٹھ دنوں کی گنتی۔ دو دفعہ گنتی پوری کر کے اپنے گاؤں سے دور ہائی سکول چلا گیا۔ جو گاؤں کے سکول سے مختلف مگر دل چسپ تھا۔ اسمبلی میں پہلے تلاوت، ترجمہ، حافظ صاحب کا مختصر بیان اور پھر کسی لڑکے کی کسی موضوع پہ پانچ منٹ کی تقریر۔ میں نے کہیں سے ایک مضمون نقل کیا، اسمبلی میں سنا دیا۔ بہت داد ملی۔ پھر کتاب کے اوراق جو کھلے تو نئے نئے مضامین سامنے آئے۔ جناب نذیر قریشی اور ملک غلام محمد صاحب کی معاونت سے مختلف مباحثوں میں انعام جیت کر لایا...... انٹرمیڈیٹ کے بعد ٹیکنیکل کالج میں داخل ہوا۔ ٹیکنالوجی کے لیے Apptitude ٹیسٹ میں مجھے کسی شعبے کے لیے موزوں نہ پایا گیا۔ ڈاکٹر وہاب صاحب نے انکشاف کیا کہ امان اللہ شاعر یا ادیب تو ہو سکتا ہے انجینئر نہیں بن سکتا۔ میرے ٹیوٹر کفیل مرزا جو کالج میگزین کے انچارج بھی تھے اس شرط پہ مجھے اپنے مضمون میں پاس کرنے پہ آمادہ ہوئے کہ میں میگزین کے لیے کوئی نظم غزل یا کہانی لکھوں۔ یوں انگلش میں فیل ہو جانے کے خوف سے میں نے پہلا افسانہ لکھا جو کالج میگزین میں شائع ہوا۔

میں اور شاہد چھپ چھپ کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایک روز پارک کے بنچ پر بیٹھے ہم سگریٹ پی رہے تھے اور میں اسے اپنا تازہ افسانہ سنا رہا تھا۔ نجانے کہاں سے اس کا بڑا بھائی نمودار ہوا۔ ہم موقع واردات پر پکڑے گئے۔ سگریٹ کا پیکٹ، ماچس اور کہانی کا مسودہ ضبط کر لیا گیا۔

"یہ خط تم نے کس لڑکی کو لکھا ہے؟"

"بھائی جان یہ خط نہیں۔ میں نے کہانی لکھی ہے۔" یوں بڑے جرم کے اقرار پہ سگریٹ پینے والا جرم معاف کر دیا گیا۔ اور پھر علی مطہر اشعر کے توسط سے راز صاحب

سے رابطہ ہوا۔ طویل عرصہ مینڈک کی طرح مقامی پرچے کے کنویں سے باہر نہ نکل سکا۔ ''منشور'' کراچی، نے ''واہ کاریگر'' سے لے کر میرا ایک افسانہ چھاپ دیا۔ مجھے رسالہ ارسال کیا جو سکروٹنی میں پکڑ لیا گیا۔ پی او ایف انتظامیہ نے اس وقت کے انقلابی پرچے میں چھپنے پر میری بہت سرزنش کی۔ یوں مقامی پرچے میں میرا چھپنا بھی ممنوع قرار پایا۔

گھر کے دروازے سے باہر جو نکلے تو دنیا بڑی وسیع تھی۔ ''اوراق، سیپ، نیرنگِ خیال، ادبِ لطیف، ادبیات، فنون، قندیل، اردو ڈائجسٹ، تمثیل...... جہاں کوئی تحریر بھیجی اسے پذیرائی ملی۔ لیکن میں اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور تھا۔ لکھی جانے والی کہانی کے آسیب سے میں مہینوں چھٹکارا نہ پا سکتا تھا۔ خوف یہ رہتا کہ اگر ایک کہانی کا پرت دوسری کہانی سے جڑ جائے گا تو دونوں کہانیاں اپنا اصلی امیج کھو بیٹھیں گی۔ ایک کہانی کی اترن پہن کر دوسری کہانی کا حسن دھندلا جائے گا۔ میں مہینوں بلکہ کئی کئی سال کوئی کہانی نہ لکھ سکا۔۔۔ پھر میری خوش نصیبی کہ ''فانوسِ ادب'' کی روشنی سے دُور دُور تک مجھے راہیں نظر آنے لگیں۔ الیاس صدا، مسرور قدر رمانی، احمد جمیل، علی مظہر اشعر، استاد اکمل، سبطِ علی صبا، شاہد نصیر، حسن ناصر، محبوب ظفر، نذیر اختر، نسیم قریشی، کمال کاسگنجوی، جمال لکھنوی، تپش برنی، راز مراد آبادی، سجاد بابر، حلیم قریشی،...... یہ کرنیں آسمانِ ادب پر اپنے اپنے حسن کے رنگ بکھیر رہی تھیں...... مگر حالات وواقعات کی مسموم ہواؤں سے یہ فانوس بجھ گیا...... اندھیرا چھا گیا...... رات اُتر آئی اور میں ایک لمبی نیند سو گیا۔ جاگا تو اکیسویں صدی دروازے پر دستک دے رہی تھی...... میدان میں کچھ خیمے گڑے تھے۔ جھونپڑیاں آباد ہو گئی تھیں۔ دُھواں سلگ رہا تھا۔ شاید کوئی نیا قافلہ اترا تھا۔ رؤف امیر، پاشاراز، اختر قریشی، امجد شہزاد، مشتاق آثم، عصمت حنیف اور بہت سارے ان کے ہمراہی...... ان فن کاروں نے تماشہ جو رچایا تو ایک رونق لگ گئی...... سکوت ٹوٹ گیا۔ روشنی اتر آئی۔ نڈھال حروف زندہ ہو گئے۔ غزلیں چہچہانے لگیں۔ پھر ان باہمت نوجوانوں نے یہ سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ دیا۔ بیس سال پہلے پاشا،

امجد اور عصمت نے صریر خامہ کی بنیاد رکھی جس پر ایک مضبوط عمارت تعمیر ہوگئی۔ رشید امجد جیسے قد آور نثر نگار اور جلیل عالی جیسے تراشیدہ ہیرے اس کی محفلوں میں رونق افروز ہوئے۔ سلمان باسط، عثمان خاور، مبارک شاہ، ڈاکٹر وحید، ملک سعید اختر، جاوید ظفر......ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس دائرے میں بیٹھ گئے۔ ایوب اختر، رفعت اقبال، غیور حسین، سعید دوشی وہ تشریف لائے اور اپنے فن کے نقوش، اپنی محبت اور گہری یادیں ہمارے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ جب کبھی وہ لوٹ کر آتے ہیں تو ہم یادوں کی البم کھول لیتے ہیں اور تصویروں کی گلیوں میں گم ہو جاتے ہیں......اور دور کہیں ماضی میں جا نکلتے ہیں۔ جب کبھی حالات کی اونچ نیچ سے یہ دائرہ ٹوٹنے لگتا ہے تو امجد، عصمت اور مشتاق ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر کھیل دوبارہ شروع کرتے ہیں، یہ دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ تبسم ریحان، طالب انصاری، خالد قیوم تنولی، شجاعت حسین، قاضی عارف، الطاف فیروز محمد عارف، محمود ساجد، مجید حبیب، اشفاق قریشی، اظہر نقوی، فضل حسین صمیم، شمشیر حیدر، ارشد علی، مظہر حسین سید، وقار آصف، دلاور علی آزر، نیر سیف، شاہ جہان سالف، فیصل ساغر، عمران صفدر، مطیع الرحمان، شعیب ہمیش، زید گل، اسرار الحق......کبھی کبھی میں بھولنے پہ آتا ہوں تو اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ صرف ایک 'میں' میرے پاس رہ جاتی ہے۔ اپنی ذات تک سمٹ آنے والی تنہائی مجھے نڈھال کر دیتی ہے۔ میں بشیر آزر اور طفیل کمال زئی کا ذکر کرنا بھول ہی گیا جن کے ساتھ ایک عمر گزری۔ اُن سے بہت کچھ سنا، پڑھا اور بہت کچھ سیکھا۔ ارشد علی ارشد کو میں کیسے بھول گیا جس کے ذکر کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے جو میرے جذبوں سے میل کھاتے ہوں۔ ضیاء المصطفیٰ ترک گو بہت دیر سے ہمارے ساتھ شامل ہوئے مگر آتے ہی اگلی صفوں میں جا گھسے۔ اردو ادب کی سب جہتوں سے آشنا۔ جب کسی گفتگو کا پرت کھولتے ہیں تو روشنی بکھرتی چلی جاتی ہے۔

صد شکر اس رب کریم کا جس نے مجھے قلم دیا اور روشنی دی۔ اُس دائرے میں جگہ دی جہاں بیٹھے خاک نشین صاحبِ علم، صاحبِ ذوق اور صاحبِ نظر درویش تھے۔ انھوں

نے مجھے ایک تسبیح پکڑا دی...... ایک ایسا اسمِ اعظم سکھایا...... جس کا ورد ختم ہوا تو میری دنیا بدل چکی تھی۔ میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ دھند نے مجھے لپیٹ رکھا تھا۔ پھر یہ دھند چھٹتی چلی گئی...... روشنی پھیلنے لگی...... کاغذ لیا، قلم اٹھایا، اس کا نام لکھا...... پھر جیسے نور پھیلتا چلا گیا اور میں لکھتا چلا گیا۔

''ہماری محبتیں، ہمارے جذبے، ایک ڈھونگ ہیں۔ ہمارے آنسو جن میں قلم ڈبو کر ہم محض کہانیاں لکھتے ہیں اور اپنی ذاتی زندگی کو ان آلودگیوں سے پاک رکھتے ہیں۔ وہ لڑکی جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جب ٹوٹ گئی تو میں نے ایک گھر بسا لیا......''

''رستم...... جیٹھ ہاڑ کی چلچلاتی دھوپ میں تارکول کی جلی سڑکوں پر ہاتھ میں کارخانے سے ملنے والے نئے بوٹ پکڑے ننگے پاؤں دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ میں اگر اس کو روکتا، کسی سایۂ شجر تلے بٹھا کر بوٹ پہنا دیتا تو میری کہانی کیسے مکمل ہوتی......!''

''عبداللہ خان جس نے جان کو ہرڈلز ریس میں شکست دے کر گولڈ میڈل جیت لیا تھا حالات سے مات کھا کر، برستی بارش میں میرے پاس گولڈ میڈل لیے اگر پیسے مانگنے نہ آتا تو میں یہ کہانی کیسے لکھتا۔''

''ٹھیلے والے کے میٹرک پاس لڑکے کو چمڑے کا تھیلا اٹھائے، ٹھیلے کی ہتھی تھامے ریلوے لائن کے ساتھ بھاگتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ سب انجینئر بن جاتا تو میں ایک اچھی کہانی سے محروم ہو جاتا۔''

''جان اگر کرسمس کی رات بلیک بورڈ پر چاک سے نوحہ نہ لکھتا تو اس کی قبر کا کتبہ کون لکھتا اور میں یہ کہانی کیسے لکھتا۔''

''سردار محمد خان ایک بھرپور زندگی گزار کر اپنی حویلی سے پہلی دفعہ بغیر کلاہ پہنے چارپائی پہ لیٹا سفید جوڑے میں نکلا تو حویلی ویران ہو گئی۔ لوٹ مچ گئی۔ اور میرے ہاتھ صرف ''کل کی بھیگی آنکھ'' لگی۔

میں ممنون ہوں ان سچے کرداروں کا جو وجود رکھتے تھے، مجھے ملے اور کہانیاں

دے گئے۔ اور میرے دوست جو مجھ کو زخمی فقیر کو تساہل کی سیلن زدہ کوٹھڑی سے باہر کھینچ لائے، کتاب کی ریڑھی پہ بٹھا دیا۔ بازار میں لے آئے اور ایک ڈھلوان پہ چھوڑ دیا۔

امان اللہ خان
مکان نمبر F-96، لین نمبر 6،
آفیسرز کالونی، فیز II،
واہ کینٹ
فون: 0514-540251
aliaman@hotmail.co.uk

بے خواب سفر

ریلوے لائن کے کنارے چھوٹے سے کوارٹر کی ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھا میں اپنی زیست کی گاڑی ریل ٹریک پر چلتا ہوا دیکھ رہا ہوں...... میں اپنے ازل سے اس کھڑکی میں بیٹھا ہوا ہوں...... کہیں بھی جاتا ہوں تو اپنی سوچ کی ایک آنکھ اس کھڑکی کی چوکھٹ پہ دھر جاتا ہوں اور یہ آنکھ بغیر پلکیں جھپکائے راستوں پہ نظر رکھتی ہے...... ایک خوف سا رہتا ہے کہ آنکھ جھپکے گی تو منظر کہیں کھو جائے گا...... راستے کہیں گم ہو جائیں گے اور میں کھڑکی میں تنہا بیٹھا رہ جاؤں گا...... میں اندیشوں کی سولی پہ لٹکا ہوا ہوں...... خوف کے مارے میں نے تنہائی کے آسیب کو اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا ہے...... یہ مجھ سے دست و گریباں ہے...... مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ اژدھا اگر میری گرفت سے نکل گیا تو مجھے نگل لے گا...... اور تنہائی پریشان ہے کہ اگر میں اس سے یوسف کی طرح دامن چھڑا کر بھاگ گیا تو وہ تنہا اور رسوا ہو جائے گی...... نیولے اور سانپ کی طرح ہم دونوں اپنی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

چھوٹے سے بستے میں تختی، قاعدہ اور سلیٹ کے علاوہ میں نے سوچ کے بہت سارے بوجھ اٹھا رکھے تھے...... میں وجود کی آنکھ سے راستے ٹٹول ٹٹول کر سکول جاتا...... راستے...... جو بڑی احتیاط سے ٹیلے سے نیچے اُترتے اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور میرے سکول تک جاتے...... سکول جو سیڑھیوں کی طرح تھا...... اوپر کو جاتی سیڑھیاں...... حروف اور ہندسے ایک ترتیب اور ایک توازن سے اُن سیڑھیوں پہ کھڑے ہوتے۔ میرا

اُستاد میرے شعور کی انگلی پکڑ کر ایک سے دو...... دو سے تین 'ا' سے 'ب' اور 'ب' سے 'ج' کی سیڑھی پہ لے آتا: مجھے کچھ متوازن کر کے میری انگلی چھوڑتا تو ہچکچاہٹ اور خوف کے مارے میں سیڑھیوں کے قدموں میں گر جاتا۔

Steeltape پہ لکھے تمام ہندسے دس۔نو۔آٹھ۔سات چھ اور پانچ کر کے ڈبی کے اندر چلے جاتے ...... اور میں تہی دست اپنا بستہ اٹھائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے کوارٹر کو جانے والی پگڈنڈی عبور کرتا تو بری طرح ہانپ جاتا۔دروازہ کھولتا تو نیم تاریک کمرہ اژدہا جیسا منہ کھولے نڈھال پڑتے جیسا میرا وجود چھپکلی کی طرح نگل لیتا......

اکیلے کمرے ...... مختصر برآمدے اور چار گز صحن کے اس گھر میں ہمیں روشنی کی اتنی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی ...... کمرے کے اندر کی چیزیں بغیر دیکھے مل جاتی تھیں، گھر میں سامان ہی کتنا تھا چند برتن جو چولھے یا گھڑے کے پاس پڑے رہتے ...... گھڑونچی پہ رکھے دو گھڑے نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ایک جستی بالٹی ...... آٹے کا ٹین ...... مرچ مصالحے کے ڈبے ...... دو چارپائیاں ...... رسی پہ لٹکے چار کپڑے ...... تھیلے کے ٹوٹے ہوئے پُرزے ...... فش پلیٹیں ...... زنگ آلود نٹ بولٹ ...... صحن کے ایک کونے میں رکھے لکڑی کے پرانے سلیپر ...... دوسرے کونے میں پتھر کے کوئلے کی ایک ڈھیری جو انجن لوہار خانے سے اُٹھا لائے تھے ...... کوئلہ جلانے والی ایک انگیٹھی ...... کمرے سے دیوار تک بنی پانی کی نالی ...... یہ کُل دنیا تھی جہاں میں اور امی تنہا رہتے تھے ...... دو بکریاں، بھیڑ، گائے اور تین ایکڑ زمین گاؤں میں ماں نے سنبھال رکھی تھی ...... زندگی بڑے غیر محسوس انداز سے گزر رہی تھی ...... سلسلہ در سلسلہ ایک سے معمولات، دھیمی چال سے ایک دوسرے کے پیچھے چلے آ رہے تھے ...... اس برانچ لائن پر شمال اور جنوب سے آنے والی گاڑیاں اس پہاڑی ریلوے سٹیشن پر چند لمحوں کے لیے رُکتیں اور سیٹیاں بجاتی ہوئی سرنگوں کے اس پار چلی جاتیں ...... انجن کا دھواں دیر تک ٹنل سے رستا رہتا ...... اداس خاموشی ...... شام ہوتے ہی اندھیرے کو اوڑھے کر وادی کی گود میں سو جاتی۔

سکول سے آنے کے بعد میں اپنے کوارٹر ہی میں رہتا...... فرش پر کوئلے سے متوازی لائنیں بناتا...... بغیر پہیوں کے لوہے کے ٹین کے انجن اور لکڑی کے ٹکڑوں کے ڈبے جوڑ کر گاڑی کو اس فرضی لائن پر چلاتا...... منہ سے سیٹی بجاتا...... سٹیم انجن کی طرح چھک چھک کرتا...... قلم کے سرکنڈے سے سگنل بناتا...... کانٹے بدلتا...... فرضی پھاٹک بند کرتا...... کبھی کبھی انجن میں ڈرائیور کی جگہ اور کبھی پچھلی بریک میں بیٹھ کر گارڈ کی طرح سیٹیاں بجاتا...... اور یوں میری گاڑی چلتی رہتی...... اور میں تنہا ان بے جان لوہے کے ٹکڑوں سے کھیلتا رہتا...... مگر میں تنہا کب تھا...... میری سوچ کے وجود میں بہت سارے لوگ تھے ...... سٹیشن پر مسافروں کی بھیڑ لگی تھی...... انجن ڈرائیور...... گارڈ...... کانٹے والا...... سٹیشن ماسٹر...... پانی پلانے والا کریم...... مین اور جھاڑو والا مٹرو...... مگر میں اس فرضی کھیل میں اُس کو شامل نہ کرتا...... صرف وہی لوگ جو میرے ابّی جیسے تھے یا اُن سے بالاتر...... میں اپنے طبقے کی دہلیز سے نیچے اتر کر کبھی نہ آیا۔ مٹرو، جیدا، کالا، کنچھا اور سرداراں جو ساتھ والی چوکی میں رہتے تھے اُن کے بہت سارے بچے تھے جو سارا دن نالی کے اُس پار چوکی کے سامنے کانچ کی گولیوں سے کھیلتے رہتے اور میں نالی کے اس پار اکیلا لوہے کے ٹکڑوں سے کھیلتا رہتا۔

ابّی اکثر دیر سے گھر واپس آتے...... تھکے تھکے سے...... انہوں نے ٹھیلے کی ہتھی تھامے ریلوے لائن پر بھاگ بھاگ کر اپنی زندگی کا بہت سا سفر طے کر لیا تھا...... وہ بوجھل قدموں سے دھیرے دھیرے چلتے تھے...... جھکے کندھوں پہ چمڑے کا تھیلا اٹھائے...... جس میں ٹرالی کے اوزار ہوتے۔ کپڑے کی سرخ جھنڈی...... روشنی کی تین رنگوں والی لالٹین...... سرخ...... سبز...... اور سفید...... روشنی کے یہی رنگ تھے جو ہمارے گھر میں تھوڑی دیر کے لیے بابا مجھے دکھانے کے لیے روشن کرتے...... پھر اندھیرا چھا جاتا یا پیلے مریل چہرے والی لالٹین جلتی بجھتی آنکھوں سے زندگی کے آخری کناروں پہ لٹکے مریض کی طرح کسی نو امید صبح کے انتظار میں رات بھر جاگتی رہتی۔

رات کو بابا جلدی سو جاتے مگر میں چھچھم سے آنے والی گاڑی کے آنے تک وجود کی آنکھ کے ساتھ جاگتا رہتا۔ گاڑی چند لمحوں کے لیے رکتی اور سیٹیاں بجاتی چھک چھک کرتی چٹی کھنائی کے اُس پار چلی جاتی اور میں سماعتوں کی بینائی سے گاڑی کو بہت دُور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہتا...... اور پھر میرے وجود کے اندر ایک گاڑی چل پڑتی۔ سیٹیاں بجاتی دھواں اڑاتی مجھے دُور خوابوں کے جزیروں میں لے جاتی...... دریا کے کنارے دُور دُور تک گھنے جنگلوں سے گزرتی...... اور میں گاڑی کی کھڑکی میں بیٹھا بند آنکھوں کے خواب دیکھتا...... خواب...... جو مجھ اندھے کی چھڑی پکڑ کر اپنی مرضی سے بہت دُور نکل جاتے...... اور میں جب واپسی کا راستہ بھول جاتا...... تو صبح ہو جاتی...... جب کہ کھلی آنکھوں کے خوابوں کو آدمی انگلی سے پکڑ کر اپنی مرضی سے لے کر چلتا ہے...... خوابوں کے سارے منظر دیکھے بھالے ہوتے ہیں......

میرے ابّا نے بھی کھلی آنکھوں کے کچھ خواب سوچ رکھے تھے...... وہ سارے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ ان کے خواب سارا دن ان کے ساتھ رہتے...... ان کے ساتھ ٹھیلے پہ سفر کرتے...... وہ ٹھیلے کی ہتھی تھامے میلوں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے...... ان کی آنکھیں خواب بُنتیں...... سوچ کے محدب عدسے سے میرے کم سِن وجود کو جوان دیکھتے۔ گرے سوٹ میں ملبوس سولا ہیٹ پہنے وہ مجھے نرالی کی گدی والی سیٹ پر بٹھا دیتے اور پھر ان کی آنکھوں کے سارے خواب ایسوسی ایٹ انجینئر کے فریم میں منعکس ہو جاتے...... ننگے تپتے قدموں سے بابا کا روز کا سفر برسوں سے جاری تھا۔

میرے بابا کے پاس صرف ایک ہی خواب تھا...... میرے مستقبل کا خواب...... وہ مجھے نرالی کی گدی والی سیٹ پر دیکھنا چاہتے تھے۔

شام کو ڈیوٹی سے فارغ ہوتے تو مجھے امجد بابو کے گھر لے جاتے...... اس کی بھینس کو چارہ ڈالتے...... دودھ کی بالٹی اٹھا کر ہوٹل لے جاتے...... گھر کا سودا سلف لاتے...... رات کو انگیٹھی روشن کرتے...... اور میں بابو کے پاس بیٹھا حرفوں کو لفظوں میں اور لفظوں کو

فقروں میں جوڑتا...... ہندسوں کی ضرب تقسیم اور جمع تفریق کے گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کرتا...... یوں امجد بابو روز کے روز میرے بابا کی مزدوری چکا دیتے۔

معمول کے اس دائرے کا سفر برسوں جاری رہا۔

پرائمری کے آخری امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا...... مارچ نے اپنے سارے ادھ کھلے پھول اپریل کی گود میں ڈال دیے تھے...... میں نے نیلے پیلے اور سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ بنایا...... دھریک کی کنواری خوشبو سے اُسے باندھ دیا۔ بستے میں آج کتابوں کی بجائے گلدستہ ڈالا اور سکول چلا گیا...... گلدستہ پانی کے گلاس میں سجایا اور میاں جی کی میز پہ رکھ دیا۔ نتیجے کا اعلان ہُوا۔ میں بہت خوش تھا۔ سارے لمحوں کے حساب کتاب سرٹیفکیٹ کے چہرے پہ درج تھے۔ نمبروں کے درجے میں مَیں سب سے اوپر تھا۔

آج اس سکول میں میرا آخری دن تھا...... پانچ سالوں کی ساری یادیں میں نے دل کے بستے میں ڈال لیں، گزرے سال ٹاٹ میں لپیٹ کر کمرے کے کونے میں ڈال دیے اور رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ عقیدت کی تمام خوشبوؤں سمیت میاں جی کی میز پہ چھوڑ آیا۔

مگر پھر بھی میرا بہت کچھ سکول میں رہ گیا تھا۔ جب کبھی اُس لائن سے گزرتا ہوں...... ٹرین کی کھڑکی سے سکول کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی غریب الوطن قیدی ہوں...... اور یوں ہی اتفاقاً گاڑی کے ڈبے میں بند اپنے گھر کے پاس سے گزر کر کہیں بہت دور اپنی باقی عمر کی قید کاٹنے جا رہا ہوں۔

البم کے اگلے ورقوں پر تصویروں کے سارے رنگ اور تمام منظر یکسر بدل گئے تھے...... گھنی بیریوں کے بُور میں شہد کی ہلکی ہلکی خوشبو رچی ہوئی تھی...... راہوڑے کے بے ثمر درخت پہ سرخی مائل بڑے بڑے گلابی پھول تھے...... سریں کا درخت تھا...... جس کی بیسیوں بانہیں تھیں...... سیکڑوں ہاتھ تھے...... ہاتھوں میں پھول تھے...... اور پھولوں کے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی خوشبو تھی...... سوچ سوچ کر بہنے والی ندی جلترنگ بجا رہی تھی۔ وادی

میں دُور دُور تک تیتر جوڑے اپنی اپنی چاہتوں کے بول بول رہے تھے...... ایسے میں میں اکیلا تھا...... مگر میں کب اکیلا تھا...... یہ میٹھے بول...... یہ ساری خوشیاں...... یہ خوشبوئیں...... یہ تمام رنگ میرے سنگ تھے۔ گو اس بہار کے بعد بہت کچھ بدل گیا تھا مگر سُرنگوں کے اُس پار جھلار کا ریلوے سٹیشن اپنے ازل پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ "سن 1880ء" اپنے وجود کی تاریخ کی تختی عمارت نے اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھی...... اس کی عمر کے گزرے سال آس پاس بکھرے پڑے تھے...... سامنے پہاڑی نیلے پر رکھی پانی کی ٹینکی رنگوں کے سیکڑوں لیپ اوڑھ کر سوئی ہوئی تھی...... ندی کنارے قطار میں بیٹھے ریلوے کے کوارٹر ایک ایک کر کے اپنی گزری عمر کی کنکریاں ندی میں پھینک رہے تھے...... بڑے بڑے سٹیل گاڈر والا ریل کا پُل سات سرنگیں، ہر ایک نے اپنی عمر کا حساب اپنے ماتھے پہ لکھ رکھا تھا...... جب گاڑی آتی تو ساری آنکھیں جاگ اٹھتیں...... سگنل روشن ہو جاتے...... گھنٹیاں بجنے لگتیں...... کانٹے والا سرخ اور سبز جھنڈی تھامے سٹارٹر کے پاس چلا جاتا...... کریم پانی کی بالٹی اُٹھائے پلیٹ فارم پہ متحرک ہو جاتا...... صفائی والا منرو، سٹیشن بابو سب اپنے اپنے کوارٹروں سے نکل کر سٹیشن آ جاتے...... گاڑی چند لمحوں کے لیے رکتی...... اور آؤٹر سے آگے موڑ پہ گم ہو جاتی...... ایک زندگی اور ایک روشنی اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتی...... حنوط چہرے چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے اپنے اپنے بلوں میں گھس جاتے اور باقی وقت کے لیے وادی خاموشی کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔

شہر کے سکول میں داخلہ ملا۔ پہلے روز میں شرابت کے سنگ ملتان سے آنے والی پسنجر سے سکول چلا گیا...... بڑے شہر کے بڑے سکول کے بڑے بڑے کمرے تھے...... کمروں کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں...... ٹاٹ سے اُٹھ کر آیا تھا...... ڈیسک اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی...... یوں لگ رہا تھا کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر چلتی گاڑی میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں گھس آیا ہوں۔ سہ پہر کو چھٹی کے بعد تھل ایکسپریس سے واپس چلا گیا۔

گرے نیکر، milk white ہاف sleeve کی شرٹ جس کی جیب پر سنہری چمکتا ہوا اسکول کا بیج لگا ہوا تھا...... گھٹنوں تک سفید جرابیں...... سیاہ چمکتے بوٹ...... بہت ساری زپوں والا اسکول بیگ...... پلاسٹک کا ٹفن باکس...... رنگوں والی پنسلیں...... ربڑ...... شارپنر...... رنگین تصویروں والی مجلد کتابیں اور کاپیاں...... آج نہ میرے پاس تختی تھی نہ سلیٹ تھی...... نہ سرکنڈے کا قلم تھا...... نہ سنگ مرمر کی سلیٹی تھی...... نہ گاچی تھی نہ کالی سیاہی والی بغیر ڈھکن کے مٹی کی دوات تھی...... مجھ سے مختلف...... کوئی بہت مختلف آج میرے وجود میں تھا...... کوئی اجنبی تھا جسے دیکھ کر چوکی کے کالے کلوٹے لڑکے کانچ کی گولیاں چھوڑ کر حیرت اور حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے اور میں اُن سے بات کیے بغیر گزر گیا۔ آج کچھ تو میرے وقار کی بات تھی اور کچھ اُن سے زیادہ بات چیت بھی نہ تھی۔ وہ نالی کے اُس پار تھے اور میں نالی کے اِس پار...... مَیں ایک لمحے کے لیے رکا اور ہلا ہلاتے ہوئے اپنے کوارٹر چلا گیا۔

اندر تو سب کچھ ویسا ہی تھا۔

پھر میں جلد ہی اپنے آپ سے مانوس ہو گیا...... لباس، چال ڈھال اور ماحول بدلتا ہے تو سوچ بھی بدل جاتی ہے مگر معمولات وہی رہے...... راستے وہی رہے...... روز کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ ہفتے کی شام تک میں ٹوٹ کر بکھر جاتا...... شام کی گاڑی سے بے بے گاؤں سے آجاتی...... پوٹلیاں...... دیگچے...... ڈبے...... مکئی کا آٹا...... دودھ...... لسی...... مکھن...... بیر...... شہتوت...... انڈے...... وہ میرے لیے اپنی پوری کائنات سمیٹ لاتی...... میری ماں بہت خوب صورت عورت تھی...... گاڑی سے اترتی تو شام کے دھندلکے میں پلیٹ فارم پر ایک روشنی سی پھیل جاتی...... وہ مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی...... اپنے ہونٹوں سے میرے چہرے کی تھکاوٹ چوس لیتی...... سرمے کی طرح مجھے اپنی آنکھوں میں ڈال لیتی اور میں ماتا کے دریا کنارے چاہتوں کی گھنی چھاؤں میں ایک طویل وقت کے لیے سکھ کی میٹھی نیند سو جاتا۔

چھٹی کے روز اجی گھر اور ماں کے لیے سودا سلف لینے شہر چلے جاتے۔ اگلے روز صبح کی گاڑی سے ماں گاؤں اور میں سکول چلا جاتا اور اجی کھیلے کی بختی تھامے اپنی سوچوں اور خوابوں کو اوڑھے ریلوے ٹریک پر ایک روبوٹ کی طرح دوڑتے رہتے۔ گھڑی کی سوئیوں کی طرح ہم اپنے اپنے دائروں کے سفر میں اپنی اپنی رفتار سے چلتے رہتے اور ہفتے کی شام ایک نقطے پر آن ملتے ...... ان راستوں پہ چلتے چلتے سیکڑوں گھڑیاں گزر گئیں ...... غیر محسوس انداز میں بہت کچھ بدل گیا تھا ...... نیکر کی بجائے اب میں 36 انچ کی پتلون پہن کر سکول جاتا۔ موٹی موٹی کتابیں رات گئے تک کیروسین لیمپ کی روشنی میں پڑھتا۔ بابا اب ہیڈ ٹرالی مین ہو گئے تھے۔ ان کو اب کھیلا نہیں دھکیلنا پڑتا تھا ...... مگر بابا کے خواب وہی پرانے تھے ...... وہ خواب بنتے تھے ...... میں خواب پڑھتا تھا ...... وہ خواب دیکھتے تھے میں خوابوں کے سوال حل کرتا تھا ...... وہ خواب سوچتے تھے میں خوابوں کی نظمیں یاد کرتا تھا:

"O! stay " The maiden said
"and rest thy very head upon her breast"
Tear stood in her bright blue eyes
but still he answers with a sigh.

ہم اس دائرے میں چلتے رہے ......

پھر ایک روز یہ دائرہ ٹوٹ گیا!

دسمبر کا آخری ہفتہ تھا ...... اُس روز گاڑی لیٹ تھی۔ آؤٹر سے کچھ پیچھے Caution پہ گاڑی رکی ...... ماں سمجھی سٹیشن آ گیا ہے ...... وہ جلدی سے اتری ...... گاڑی چل پڑی۔ وہ اپنی پوٹلیاں اور ڈبے سمیٹتے ہوئے دوبارہ گاڑی پہ سوار ہونے لگی۔ پائیدان سے پاؤں پھسلا ...... ایسی گری کہ دائیں ٹانگ کٹ گئی ...... ہمارے سارے خواب بکھر گئے ...... ہماری خوشیاں ٹوٹ گئیں۔ ڈِڈو کمہار کی آوی کی طرح سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہو گیا۔

وہ ڈیڑھ ماہ بعد ہسپتال سے مصنوعی ٹانگ اور بیساکھیوں سے چل کر گھر واپس آ گئی ...... ہم اکٹھے رہنے لگے۔ شام کو سکول سے واپس آتا تو گھر کے دروازے کے باہر

بیساکھیوں کے سہارے ...... یاس بھری مسکراہٹوں کے ساتھ اسے اپنا منتظر پاتا۔ میں احتیاط سے اُس سے لپٹ جاتا۔ کہیں ٹوٹا ہوا وجود بالکل ہی نہ بکھر جائے ...... ماں کو اپنی ٹانگ کے کٹ جانے کا بہت دکھ تھا۔ اس کے گاؤں کا سلسلہ اجاڑ اور اس کا گھر ویران ہو گیا تھا ...... ماں کی ٹانگ کیا ٹوٹی، گاؤں کے گھر کا بڑا ستون ٹوٹ گیا۔ سارا سلسلہ کڑیوں سمیت نیچے آن گرا تھا۔ بکریاں، گائے، زمین سب کچھ منڈی پر بک گیا۔ زمین ٹھیکے پہ دے دی گئی ...... تالوں کو زنگ لگ گیا ...... ماں کبھی کبھی خالی ڈبے، دیگچیاں اور پوٹلیاں کارنس سے اتار لیتی ...... پہروں کچھ سوچتی رہتی۔

قلم، دوات، کاپیاں، انگریزی، ریاضی، سائنس ...... میں نے بہت سے ایسے مسائل دیکھے تھے مگر آج تک اندر کا دکھ نہ دیکھا تھا۔ یہ پہلی اندر کی چوٹ تھی جو بڑی شدید تھی۔ ایک گھٹن سی دل کو دبوچ لیتی ...... ایک بے چینی اور ایک اضطراب روح میں پھیل جاتا ...... اور بابا ...... وہ تو پہلے ہی کم بولتے تھے ...... اب تو بالکل ہی چپ سادھ لی تھی ...... جس روز وہ بے بے کی کٹی ہوئی ٹانگ گاؤں کے قبرستان میں رات کو دفن کر کے لوٹے تھے دکھ کے اس بوجھ سے وہ بالکل نڈھال ہو گئے تھے ...... ان کے کاندھے جھک گئے تھے۔ چہرے پہ گزرے سالوں کی لکیروں کے اوپر ایک اور بڑھاپا آن گرا تھا ...... یوں لگتا تھا انہوں نے ان تھوڑے سے دنوں میں زندگی کے بہت سے سالوں کا سفر طے کر ڈالا ہے ...... انہیں مسلسل بخار رہنے لگا ...... سردی ان کی بے رس ہڈیوں میں سرایت کر گئی تھی ...... وہ کمبل اوڑھے سورج طلوع ہوتے ہی ٹرالی کے شیڈ کے پاس آ جاتے۔ سفاری سوٹ میں ملبوس ...... سولا ہیٹ پہنے ...... چمکتے بوٹوں کے ساتھ نقوی صاحب پتھر کی، بنگلے تک جاتی سیڑھیوں سے اُتر کر شیڈ تک آتے ...... تو یہ تصویر اپنے تمام زاویوں سمیت بابا کے دل میں اتر جاتی ...... ان کے خواب ...... بلکہ زخمی خواب تازہ دم ہو جاتے ...... وہ ماتھے تک ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے۔

''شیر جنگ! تم آرام کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

ٹرالی چلی جاتی...... تو اجی کی سوچ اسی ٹریک پر اپنا سفر شروع کر دیتی...... مگر وہ ٹھیلے کو نہ پہنچ پاتی...... پھر آہستہ آہستہ سوچ کی آنکھوں میں منظر دھندلانے لگتے...... ایک دبیز دھند چھا جاتی...... سب کچھ گم ہو جاتا تو بابا بھاری قدموں سے کوارٹر واپس آ جاتے۔

بے بے اور اجی دونوں چپ سے حالات کے سمندر میں ڈوب جانے والے جہاز کے بچ جانے والے مسافروں کی طرح کسی تختے پہ سوار یاس کی چادر اوڑھے کسی ساحل کی اُمید میں زندہ تھے۔

ٹوٹتے ہوئے خوابوں کے اس سفر میں مَیں بھی ان کے ساتھ تھا...... عمر کے جس حصے میں دوسرے بچے کانچ کی گولیوں سے کھیلتے تھے، میں اپنی سوچ کے دائرے میں بیٹھ کر شیشے کے تاج محل تعمیر کرتا تھا...... پتھر کی جن سیڑھیوں سے اتر کر نقوی صاحب ٹرالی کے شیڈ تک آتے تھے، میں ان سیڑھیوں کی انتہا تک جانا چاہتا تھا۔

پہلے سفر کا آخری امتحان آن پہنچا...... تلخیوں اور پریشانیوں کے سارے دھبے ذہن کی سلیٹ سے مٹا ڈالے...... تمام سوالوں کے سارے جواب پورے لوازمات کے ساتھ حل کیے۔ تیز رفتار زندگی کے بہتے ہوئے دریا کے عین وسط میں مَیں ایک جھولتے ہوئے معلق پل صراط پہ کھڑا اپنے آپ کو متوازن کرنے کی کوشش کر رہا تھا...... ماں بغلوں کے نیچے بیساکھیاں لیے کھڑی تھی...... بابا دو ہفتے کی Sick Leave ہی کے دوران خون تھوکنے لگے تھے...... ڈاکٹر نے انہیں ایک لمبے عرصے کے لئے سینی ٹوریم کے لئے Advise کیا تھا۔ بابا وہاں اکیلے جانے کے لیے تیار نہ تھے...... ماں ادھورے توازن کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی...... میرے میٹرک کے پریکٹیکل ہونا ابھی باقی تھے...... ایسے میں بابا کو اکیلے ہی جانا تھا مگر وہ مجھے ساتھ لے جانے پہ بضد تھے۔

"بیٹا! میں بہت ہی اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔"

مگر کیسے...... وہ تو پچھلی گزری زندگی کے تمام راستوں پر خوابوں کی ایک بارات لے کر تنہا ہی چلے تھے...... پھر وہ اکیلے کیوں تھے! ہم دونوں اپنے سالم وجود، اپنی سوچ،

دکھوں، خوشیوں سمیت بابا کے ساتھ تھے ...... پھر یہ ریل ٹریک کا سفر تھا۔ بابا کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔

ایک اُداس شام وہ کوئٹہ ایکسپریس سے سینی ٹوریم چلے گئے ...... ایک چپ اور ایک سناٹا ہمارے چھوٹے سے کوارٹر میں چھوڑ گئے ...... مگر وہ جلد ہی واپس آ گئے ...... ہم سے رُوٹھے رُوٹھے ...... خاموش ...... مہر بہ لب ...... ہلکے نیلے لباس میں ملبوس گئے تھے ...... سفید کورے لٹھے میں لپٹے واپس آئے ...... حیرت بھرے دکھ نے ہمیں نڈھال کر دیا ...... ماں کی اُداس آنکھوں میں دفن دکھ کے آنسو پلکوں ہی میں اُلجھ کر رہ گئے۔ میں نے بھی اپنے دکھ پلکوں پر آنے سے پہلے سمیٹ لیے۔ کون تھا جس کو اپنا دکھ دکھاتے ...... ہم تو صرف دو ہی تھے۔ اور آج دونوں تنہا تھے ...... وہ تیسرا ہاتھ ہی چھوٹ گیا تھا جس کے اُلٹے سیدھے ہونے سے ہار یا جیت ہوتی تھی ...... جیت بھی ہماری تھی ...... ہار بھی ہماری تھی ...... ایسا تو کہیں دُور دُور بھی گمان نہ تھا ...... ٹی بی تو بند مٹھی سے ذرہ ذرہ کرنے والی ریت کی طرح ہوتی ہے ...... سالوں میں کہیں جا کر خالی ہوتی ہے ...... بابا جب گئے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کسی Releaving ڈیوٹی پہ جا رہے ہوں ...... یہ تو معلوم نہ تھا کہ وہ واپس زندہ نہیں آئیں گے ...... اتنی جلدی وہ ٹوٹ کر بکھرنے والے بھی نہ تھے۔ بڑے مضبوط اور سخت جان تھے مگر جب کوئی سخت چیز ٹھوکر سے ٹوٹتی ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے والا اپنے سارے خواب بند آنکھوں میں سمیٹ کر سفید کفن اوڑھے اپنی ابدی بنیادوں میں جا کر سو گیا تھا۔ جب کہ ہمارے چھوٹے سے گھر کی ساری دیواریں اسی ایک پتھر پہ کھڑی تھیں ......

تحفظ کی دیواریں گر گئیں ...... سوچوں اور خوابوں کے نیلے پیلے دائرے ٹوٹ گئے ...... طوفان گزر گیا تو دھول اور راکھ رہ گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جن راستوں پہ چل رہے تھے ان سے بھٹک کر بہت دُور نکل آئے تھے ...... ان اجنبی راستوں پر ٹٹول ٹٹول کر اپنے وجود کی خبر پاتے ...... بہت دنوں میں اپنے آپ کو سمیٹ پائے ...... کھو جانے والا ہندسہ تو صرف

ایک ہی تھا جب کہ اس سے جڑے صفر کے دو وجود میسیوں پہ بھاری تھے...... گنتی کہاں سے شروع کریں...... کہاں سے بھولے تھے کچھ یاد نہیں آ رہا مین سرکٹ ٹوٹا تو سکرین کے سارے ہندسے گل ہو گئے...... تمام بٹن ٹوٹ لے...... پچھلے سارے اندازے کھو گئے تھے...... تمام حساب غلط ہوئے...... کمپیوٹر کی سکرین پر صفر کی ایک طویل قطار کھڑی تھی...... اور اس قطار میں میں تنہا کھڑا تھا۔

پھر ایک روز نقوی صاحب نے مجھے اپنے بنگلے بلوا بھیجا۔ دستِ شفقت میرے سر پہ رکھ دیا...... میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

''تمھیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شیر جنگ ابھی زندہ ہے...... انسان طبعی موت سے مر نہیں جاتا صرف اس کا مٹی کا بت مٹی میں دفن ہوتا ہے...... وہ خود تو اپنے بچوں کے وجود میں زندہ رہتا ہے...... میری بات سمجھ رہے ہو نا! مجھے احساس ہے کہ تمھاری تعلیم ادھوری رہ گئی ہے...... ایک راستہ بند ہوتا ہے تو سفر رک نہیں جاتا...... ایسے میں نئے راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں...... چھوٹی سی نالی میں بہنے والا پانی اگر چلتا رہے تو یہ پہلے نالے میں اور پھر دریا میں اُتر جاتا ہے۔ اور ایک روز سمندر کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے۔ کوئی پتھر اس کا راستہ روکے تو وہ نیا راستہ بنا لیتا ہے...... ہمت چھوڑ کر اگر رک جائے تو وہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے...... مادی چیزوں اور چلتے پھرتے انسانوں کے رویے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں...... صرف ان کی شناخت اپنی اپنی ہوتی ہے۔''

میں بہت دیر تک بڑے غور سے نقوی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔

''Relay ریس میں کھلاڑی ٹریک پہ دوڑ کر جب اپنا راؤنڈ مکمل کرتا ہے تو baton دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ بیٹا! اب دوسرا راؤنڈ تمھارا ہے۔ Baton اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ شاید تم اس کے لیے تیار نہ ہو...... مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ حالات اور مجبوریاں بڑی کٹھور اور سنگ دل ہوتی ہیں...... ایک صورت یہ ہے کہ تم گاؤں چلے جاؤ مگر تم وہاں جا کر گاؤں کی مٹی میں مل جاؤ گے...... یہاں اگر رکتے ہو تو Daily wages میں

تمھارا نام ڈال دیتا ہوں...... تم میرے ساتھ نرالی پہ رہنا...... میٹرک کے Result کے بعد تم کو چابی والوں میں رکھوا دوں گا...... پھر تم P.A مستری ہونے کے بعد جب سلیکشن گریڈ میں جاؤ گے تو میں تم کو واشن بھجوا دوں گا...... اور پھر تم سب انجینئر ہو جاؤ گے۔''

''میں نے کہا ناں...... قطرے کا سفر سمندر تک بہت طویل اور تھکا دینے والا ہے...... مگر...... میں نے نالی کے پار والی چوکی میں تمھارے لیے ایک کوارٹر خالی کرا دیا ہے۔ سوچ لو...... فیصلہ کر لو...... اور کل مجھے بتا دینا۔

نقوی صاحب نے خوابوں کی ایک گٹھڑی باندھ کر میرے سر پہ دھر دی۔ میں سلام کر کے واپس مڑا اور بھاری قدموں سے بنگلے سے نیچے آتی پتھر کی سیڑھیاں اترنے لگا......

میرے گھر کے سامنے نئے ہیڈ نرالی مین ملکو چاچا کا سامان پڑا تھا...... میں نے رات کی چادر اوڑھ لی...... اپنی منجی پیڑھی اٹھائی...... ماں کو ساتھ لیا اور نالی کے اس پار مترو کے بازو میں بغیر کھڑکا کیے جا دفن ہوا۔

کیا سوچتا...... کیا فیصلہ کرتا...... سوچ کی سکرین پر صفر کی ایک طویل قطار تھی...... اور میں اس قطار میں تنہا کھڑا تھا۔ خوابوں کی گٹھڑی میں نے اتار پھینکی...... اتی کے پتھر لیے پاؤں میں نے پہن لیے...... تھیلے کی ہتھی تھام لی اور نرسیک کے ایک بے خواب سفر پہ روانہ ہو گیا۔

□□□

رُستم

''رستم! تم بہت اچھے آدمی ہو ایک گلاس پانی پلا دو......!

''جی ضرور جی!''

''رستم! تم بہت ذلیل آدمی ہو......''

''جی! ہاں جی۔''

''رستم! تم نے آج پھر چائے کی چینی کھائی ہے۔''

''جی! ہاں جی۔''

رستم بوکھلا سا گیا ...... اور داڑھی میں اُلجھی چینی جھاڑنے لگا۔ سیاہ ڈانگری، بڑے بڑے فوجی بوٹ اور سٹیل ہیلمٹ اُتار کر وہ مختصر سا رہ گیا تھا ...... عجیب منحنی سا آدمی موٹا سا سر، ماتھا کچھ آگے کو جھکا ہوا، میلی میلی ویران آنکھیں، بھنوؤں کے بھیانک سایوں کے نیچے غاری معلوم ہوتیں۔ نیم تاریک سا چہرہ، لٹکے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ، ٹھوڑی ماتھے کی سیدھ میں کافی آگے تک نکلی ہوئی جس پر کہیں کہیں اُگے داڑھی کے بے ضرے بال، بے ڈول بڑے بڑے ہاتھوں کی پانچ کی بجائے چھ چھ انگلیاں ...... رستم کارٹون کی طرح ایک ابنارمل شکل کا آدمی تھا۔ وہ تو کوئی چابی بھرا کھلونا تھا جو بات کرنے پر ایک دم حرکت میں آ جاتا۔ دو چار بار سن کر بھی اسے بات سمجھ نہ آتی اور پھر وہ چلتے چلتے ایک دم رک جاتا۔

''جی! ہاں کیا فرمایا تھا؟''

"اچھا ٹھیک ہے......"

"کیا ٹھیک ہے؟"

"وہ جو آپ نے کہا ہے۔"

"میں نے کیا کہا تھا...... کچھ سمجھے؟"

"جی! ہاں جی......"

وہ یک دم مڑتا ڈھیلی ہوتی اپنی بے ہنگم پگڑی کو بل دے کر باندھتا اور چل پڑتا۔

وہ نہ سنتر اتھا نہ کام چور...... وہ تو کوئی چابی والا پرانا کھلونا تھا جو رُک رُک کر جھٹکوں سے چلتا تھا۔ کھدر کی کھلی قمیض، جس کی بغلی جیب گھٹنوں تک لٹکی ہوتی...... دفتر کے لیے چائے کی پتی، چینی بسکٹ کا ڈبہ، رستم کا دوپہر کا کھانا، دفتر کی ڈاک...... سب کچھ اس کی جیب میں سما جاتا۔ رستم کی عمر کا اندازہ لگانا اُس کے ڈیل ڈول سے ناممکن تھا۔ بغیر خانوں اور ڈھکن کے صندوق جیسے گھر کا رستم مالک تو نہیں مگر اس کی ضرورتوں کا ذمہ دار ضرور تھا۔ چھوٹے سے صحن والے مکان کے تنہا کمرے کے برآمدے کو بند کر کے کواڑ لگا دیے گئے تھے۔ اس ڈربے کے صحن پہ لکڑیاں جوڑ کر چھتی ڈال دی گئی تھی اور تین بھینسوں کی جگہ چھوڑ کر ایک کھرلی بنالی گئی تھی۔

دفتر سے چھٹی ہوتی۔ سب لوگ گھروں کو واپس چلے جاتے۔ لیاقت بابو اُس وقت دفتر کی ڈاک کلیئر کرنے کے بعد رستم کی رسّی ڈھیلی کر دیتا۔ رستم دودھ کا کنستر اپنی چادر میں لپیٹ کر کاندھے پہ لٹکا لیتا...... بوجھل قدموں سے اپنے گھر جانے والے راستوں پہ یوں چلتا جیسے وہ کسی فاقہ زدہ ریوڑ کا گڈریا ہو۔

روبوٹ کی طرح میکانکی انداز میں رستم ہر حکم بجالاتا۔ نہ کسی حکم سے انکار نہ کسی ذات پر غصہ...... نہ کسی سے شکایت نہ کوئی ڈیمانڈ رستم جیسے مٹی کا مادھو ہو...... اندر اور باہر سے مٹی کا بنا ہوا۔

اندر اور باہر سے مٹی کے بنے ہوئے اُس کے باپ کے گھر میں اُس کی ماں کے علاوہ اس کی ایک پولیو زدہ بہن، جوانی کی دہلیز پر ہی بوڑھی ہو گئی تھی وہ بھی برآمدے کے

پیچھے کمرے میں کھرلی پہ بندھی بھینس کی طرح بیٹھی رہتی۔ چپ، گم صم بے زبان......
اور جب کبھی بھینسوں کا کوئی بیوپاری صحن کی کھرلی پہ بندھی بھینسوں کا رستم کے باپ سے سودا کرنے آتا......

''کتنا دودھ دیتی ہے؟''
''کتنے مہینے کی ہے؟''
''کھانگڑ ہے یا گھسن ہے؟''

تو رستم کی ماں ڈوب سی جاتی۔ پھر وہ پہروں سوچا کرتی۔ ایک دھندلی سی سوچ جس کی کوئی سمت نہ ہوتی، اُپلوں کے دھوئیں کی طرح ایک سوچ جس میں دم گھٹنے لگتا...... سارے درو دیوار دھندلا جاتے...... سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ ایسے میں کمرے کے تاریک سایوں سے جھانکتی ہوئی پولیو زدہ شاداں...... اُس سے اُس کی ماں کو خوف سا آنے لگتا......
پچھلے سال ریلوے لائن سے پھسل کر نجوری بھینس گری...... اس کی پچھلی ٹانگ ٹوٹ گئی...... وہ اپنا پچھلا دھڑ بھی نہ اٹھا سکتی تھی مگر اُسے بھی قصائی لے گئے تھے...... حلال مال تھا ٹھکانے لگ گیا...... مگر مٹی کے ٹوٹے کھلونے کون خریدتا ہے۔

بونس ملا کر رستم کا باپ ایک اور بھینس خرید لایا۔ رستم کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ وہ کارخانے سے آنے کے بعد بھینسوں کو چرانے لے جاتا اور رات گئے تک بورڈ کے داروغے سے بچ بچا کر سڑک کے کنارے اُگی گھاس پر اُن کو چراتا اور واپسی پر گھاس کا ایک گٹھا بھی لے آتا۔ صبح فیکٹری کے پہلے وسل کے ساتھ دودھ کا کنستر اٹھائے ورکشاپ کی کنٹین آ جاتا۔ انھی محدود راستوں پہ چل کر رستم نے کولھو کے بیل کی طرح زندگی کے ڈھیر سارے چکر بغیر کچھ دیکھے، بغیر کچھ گنے کاٹ لیے تھے۔ ابھی کتنے دائرے اور چلنا تھا...... رستم کو گنتی بھی نہ آتی تھی۔ پہلی تاریخ کو وہ اپنی تنخواہ کوئی بیس بابوؤں سے گنواتا، چھٹیوں اور اوور ٹائم کا حساب کراتا، پوری تنخواہ اپنی لمبی بغلی جیب میں ڈال لیتا، جیب کو نیفے میں اڑس لیتا اور پھر ایک ایک نوٹ گن گن کر اپنے باپ کو دے دیتا۔ اس کی خالی جیب نجوری کھانگڑ

بھینس کے بے رس تھنوں کی طرح لٹک جاتی۔

رستم نے کبھی پیسوں کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ دفتر میں جب بابوؤں کے لئے چائے بنتی تو وہ ایلومینیم کا ایک لبالب گلاس سُڑ سُڑ کی لمبی تانوں سے دھیرے دھیرے پیتا رہتا...... جب ریڑھی والوں کے یہاں وہ بھینسوں کے لیے گلے سڑے پھل اور چھلکے چننے جاتا تو اُسے اس ڈھیر میں سے کوئی ایک آدھ ٹھیک ٹھاک سیب مل جاتا یا نیم سڑے کیلے یا باہر سے دانے کیو ڈل جاتے۔

''بابو جی! چیز اندر سے ٹھیک ہونی چاہیے چھلکا تو اوپرے اتر ہی جاتا ہے۔''

رستم کو اس طرح کی بہت ساری کہاوتیں، چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور گیت یاد تھے جنھیں وہ بے سُرے انداز میں گا کر لوگوں سے چائے پی لیا کرتا...... اپنی سادگی سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر دو چار روپے کھرے کر لیتا۔ جب وہ کھلے منہ اور رال ٹپکاتے ہونٹوں سے مسکراتا تو اور زیادہ احمق لگتا...... ایسے میں وہ ایک آدھ روپیہ اپنی بے چارگی کے اظہار پر لے لیا کرتا تھا۔

''رستم! تم شادی کرو گے؟''

''جی ہاں جی!''

''کب کرو گے؟''

''جدوں سوہنا رب کرم کرسی۔''

شادی کے ذکر سے رستم دھیرے دھیرے یوں مسکراتا تھا جیسے وہ چھوٹی چھوٹی چسکیوں سے چائے پیتا تھا۔ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی چسکیوں سے رستم اپنی زندگی کو پی رہا تھا۔ وہ چلتا بھی چھوٹے چھوٹے قدموں سے تھا۔ وہ ہمیشہ خوف زدہ سا رہتا جیسے وہ جانتا تھا کہ کوکلا چھپاکی کے اس کھیل میں جب دائرے کی دوڑ ختم ہوگی تو اُسے کھندوری کسی نہ کسی کی پشت کے پیچھے گرانی ہوگی اور کوئی لمبے قدموں والا اسے مات کر جائے گا۔

رستم...... اس میں کوئی بل نہ تھا...... کوئی پیچ نہ تھے...... اُس کی اپنی کوئی سوچ نہ

تھی...... اُس کے پاس کوئی خوشی نہ تھی کوئی دکھ نہ تھا۔ اُسے جب چائے یا ایک رس کی ورک ہوتی تو وہ ایک ضرورت کے جبر سے مسکراتا تھا۔ ایسے میں رونے یا مسکرانے کی کوئی حد نظر نہ آتی تھی۔ وہ تو ضرورتوں کے حوالے سے چلنے، بولنے، مسکرانے اور گانے والی مشین تھا۔ جذبوں کے حوالے سے وہ بھینس چرانے والا رستم تھا جس نے زندگی کا ایک سرسبز حصہ کارخانے کی بھٹی میں کوئلہ جھونکتے ہوئے راکھ کر لیا تھا...... جو کچھ باقی بچا تھا وہ بھینسوں کی کھرلی میں دفن ہو گیا تھا۔

کارخانے سے گھر تک کے فاصلے میں بھی وہ ڈانگری، ہیلمٹ اور بڑے بڑے بوٹوں میں گرفتار رہتا...... حالانکہ وہ تو بہت سیدھی سادی چیز تھا۔ رستم اپنی چیزوں کو بہت کنجوسی سے استعمال کرتا۔ جب اُسے کارخانے سے بھٹی پہ کام کرنے کے لیے نئے بوٹ ملے تھے تو وہ کئی روز ننگے پاؤں ہاتھ میں بوٹ پکڑے کارخانے آتا رہا۔ وہ خود خرچ ہوتا رہتا مگر اپنی تنخواہ کی طرح اپنی چیزوں کی بچت کرتا۔

رستم ہر کسی سے خوف زدہ رہتا۔ اپنی ورکشاپ کے فورمین سے...... لوہا پگھلانے والی بھٹی سے...... شاپ کی چھت پہ چلنے والی کرین سے...... Billet کاٹنے والے آرے سے...... گیٹ پہ کھڑے سنتری سے...... بجلی کی کیتلی سے...... جس سے اُسے ایک بار شاک لگ گیا تھا...... اپنی گلی کے کتے سے جو صرف رستم ہی کو دیکھ کر بھونکتا تھا...... اپنے باپ سے جو اُسے بات بے بات بری طرح پیٹ ڈالتا تھا...... اپنی پڑوسن بذو سے...... پتھری آنکھ والی بذو...... سات بھائیوں کی اکیلی بہن...... جانے وہ کس بھٹی میں پکی تھی۔ اُسے شاید زیادہ تاؤ لگ گیا تھا۔ اندر اور باہر سے کالی...... جب وہ بغیر پلکیں جھپکائے رستم کو گھورتی تو اُس کی روح کانپ جاتی۔ رستم اس کے سامنے بونا سا لگتا تھا۔ قد میں وہ اس کے کاندھوں سے بھی نیچے تک تھا۔ رستم نے ایک روز اُس کی بھینس کی پیتل کی ٹلی والی گانی کھول لی تھی۔ پھر ایک روز بذو نے رستم کو پکڑ لیا اور اُسے اٹھا کر ایسا پھینکا کہ کئی روز تک سرسوں کے تیل میں جلی ہلدی سے بھی اُس کے جسم کے نیل نہ گئے اور پھر جس روز ریلوے لائن سے اس کی بھوری

بھینس گری اور اس کا پچھلا دھڑ ٹوٹ گیا تو رستم اپنے زخم بھول گیا۔ نیلے پیلے اور سرخ ریشم کے دھاگوں والی پیتل کی ٹلی والی گانی اپنی بھوری کے گلے سے اُتار کر بدّو کو واپس کر دی، پھر کئی روز تک رستم نے کسی کو کوئی گیت بھی نہ سنایا اور نہ پھاوں والی ریڑھیوں کے پاس باہر سے دانے ہوئے کینو تلاش کرنے گیا۔

جاڑوں میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی روز تک جھڑی لگی رہی۔ رستم کارخانے سے سیدھا گھر آ جاتا۔ ہوٹے کی کھلی اور بھوسے کا گتاوا کھرلی میں ڈال کر اپنے بستر میں گھس جاتا۔ غالباً زندگی میں پہلی بار رستم اپنے گھر کے اندر کو اپنی سوچ کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ مٹی اور گارے سے لپے اس کے چھوٹے سے گھر کے درو دیوار۔ اُس کے گھر کی چھت میں نہ کڑیاں تھیں نہ کوئی ستون تھا سب کچھ دیواروں پر تھا۔ نہ روشن دان تھا نہ کھڑکی تھی۔ روشنی اکیلے دروازے سے اندر آتی تھی۔ کمرے میں تو صبح کو بھی شام کا اندھیرا رہتا مگر اس اندھیرے میں بھی رستم کو اس کا شعور تھا۔ وہ یہ ضرور سمجھے بیٹھا تھا کہ شاداں ان مفلوج ٹانگوں سے زندگی کا باقی سفر کیسے طے کرے گی، ماں باپ...... مگر یہ تو پرانی بیساکھیاں تھیں نہ جانے کب ٹوٹ جائیں اور رستم خود یہ سوچ رہا تھا کہ شاداں اس کے اپنے دکھ کا کیسا بوجھ ہے جسے وہ خود نہیں اُٹھا سکتا۔ رستم کے باپ نے کہیں سے انگور کی بیل لا کر دیوار کے ساتھ صحن سے لگا دی تھی جو اب پھل دینے پہ آئی ہوئی تھی اور بھینسوں کی چھپری پھاڑ کر دیوار کی منڈیر پر بانہیں پھیلائے گلی میں دُور تک جھانک رہی تھی۔

جھڑی ختم ہوئی۔ دھوپ نکل آئی۔ رستم ایسا مصروف ہوا کہ تمام دن کے لیے باہر کا ہو کر رہ گیا۔ رستم تو آگے تک دیکھنے کا عادی بھی نہ تھا وہ ہمیشہ نظریں جھکا کر صرف جانے پہچانے راستوں پہ چلتا تھا...... آنکھوں پہ پٹی باندھے کولھو کے بیل کی طرح دن رات کے اس دائرے میں زندگی کا ایک بے سوچ طویل سفر طے کرتا آیا تھا۔ اُس کے سفر کا دائرہ گھر کی دہلیز سے شروع ہو کر گھر کی دہلیز پہ ختم ہو جاتا۔ کارخانے کے conveyer کی طرح جس کی bucket خالی جاتی اور کوئلے سے بھری ہوئی واپس آتی مگر رستم کی Bucket کبھی خالی نہ

بھینس گری اور اس کا پچھلا دھڑ ٹوٹ گیا تو رستم اپنے زخم بھول گیا۔ نیلے پیلے اور سرخ ریشم کے دھاگوں والی پیتل کی ٹلی والی گانی اپنی بھوری کے گلے سے اُتار کر یدو کو واپس کر دی، پھر کئی روز تک رستم نے کسی کو کوئی گیت بھی نہ سنایا اور نہ پھلوں والی ریڑھیوں کے پاس باہر سے دانے ہوئے کینو تلاش کرنے گیا۔

جاڑوں میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی روز تک جھڑی لگی رہی۔ رستم کارخانے سے سیدھا گھر آ جاتا۔ بنولے کی کھلی اور بھوسے کا گتاوا کھرلی میں ڈال کر اپنے بستر میں گھس جاتا۔ غالباً زندگی میں پہلی بار رستم اپنے گھر کے اندر کو اپنی سوچ کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ مٹی اور گارے سے لپے اُس کے چھوٹے سے گھر کے در و دیوار۔ اُس کے گھر کی چھت میں نہ کڑیاں تھیں نہ کوئی ستون تھا سب کچھ دیواروں پر تھا۔ نہ روشن دان تھا نہ کھڑکی تھی۔ روشنی اکیلے دروازے سے اندر آتی تھی۔ کمرے میں تو صبح کو بھی شام کا اندھیرا رہتا مگر اس اندھیرے میں بھی رستم کو اس کا شعور تھا۔ وہ یہ ضرور سمجھے بیٹھا تھا کہ شاداں ان مفلوج ٹانگوں سے زندگی کا باقی سفر کیسے طے کرے گی، ماں باپ...... مگر یہ تو پرانی بیساکھیاں تھیں نہ جانے کب ٹوٹ جائیں اور رستم خود یہ سوچ رہا تھا کہ شاداں اس کے اپنے دکھ کا کیسا بوجھ ہے جسے وہ خود نہیں اُٹھا سکتا۔ رستم کے باپ نے کہیں سے انگور کی بیل لا کر دیوار کے ساتھ صحن سے لگا دی تھی جو اب پھل دینے پہ آئی ہوئی تھی اور بھینسوں کی چھپری پھاڑ کر دیوار کی منڈیر پر بانہیں پھیلائے گلی میں دور تک جھانک رہی تھی۔

جھڑی ختم ہوئی۔ دھوپ نکل آئی۔ رستم ایسا مصروف ہوا کہ تمام دن کے لیے باہر کا ہو کر رہ گیا۔ رستم تو آگے تک دیکھنے کا عادی بھی نہ تھا وہ ہمیشہ نظریں جھکا کر صرف جانے پہچانے راستوں پہ چلتا تھا...... آنکھوں پہ پٹی باندھے کولھو کے بیل کی طرح دن رات کے اس دائرے میں زندگی کا ایک بے سوچ طویل سفر طے کرتا آیا تھا۔ اُس کے سفر کا دائرہ گھر کی دہلیز سے شروع ہو کر گھر کی دہلیز پہ ختم ہو جاتا۔ کارخانے کے conveyer کی طرح جس کی bucket خالی جاتی اور کوئلے سے بھری ہوئی واپس آتی مگر رستم کی Bucket کبھی خالی نہ

رستم کی شادی ہو رہی تھی۔ صبح سویرے رستم بھینسوں کا دودھ دوہنے کے لئے اُٹھا تو اس کے باپ نے بالٹی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔

"رستم بیٹے! تم چھوڑ دو میں خود دودھ نکال لیتا ہوں۔"

"جی! ہاں جی۔"

"آج تمھاری بھی شادی ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں جی......

مگر وہ تو شاداں کی!......

مگر کس سے؟"

رستم کا باپ مسکرانے لگا۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا اپنے وجود کو ٹٹولا مگر وہ اپنا آپ کہیں کھو چکا تھا۔

"رستم یہ سودا اُٹھاؤ اور باہر تائی کے پاس لے جاؤ۔"

اُس اُجلی صبح کو جب سورج افق سے، رات بھر کے جاگے بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا تو سرخ سرخ کرنیں ڈھلی منڈیروں پہ سونا بکھیرنے لگیں۔ ایسی روشن صبح رستم نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ تو منہ اندھیرے ہی فیکٹری چلا جاتا...... مگر آج تو رستم کی شادی تھی۔ باہر گلی میں لمبی چوڑی دیگیں موٹی موٹی لکڑیوں کی آگ پر رکھے ڈھیر سارے کنوؤں میں کٹے کا گوشت پک رہا تھا۔ چاولوں کی دیگیں الگ تیار ہو رہی تھیں۔ گلی کے اس سرے سے بدو کے گھر تک رستم ہی رستم ہو رہی تھی۔

جب وہ کھارے سے اُتر کر بائیں ہاتھ پہ گانا باندھے، پُرانے کپڑوں میں ملبوس ...... ماتھے پہ سہرا سجائے ...... ہاتھ میں لوہے کی کھونڈی تھامے، کسی مزار کے مجاور کی طرح ڈھول باجوں کے ساتھ گلی میں نکلا تو آس پاس کے مکانوں کی منڈیروں اور چھتوں پہ آنکھیں ہی آنکھیں ہو گئیں۔ ایسا تو رستم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

ڈوبتی ہوئی شام کو جب بدو کی ڈولی لے کر واپس لوٹا تو اُس کی بوسکی کی قمیض،

لٹھے کی کڑکڑاتی شلوار، سر پہ ڈبیوں والی ریشمی دھوتی، تلے والی چیں چیں کرتی کھیڑیاں......

ایسے میں رستم سب سے الگ تھلگ مگر اہم سا نظر آ رہا تھا۔ شام ڈوبی تو ہنگامے آہستہ آہستہ رات کی اندھیری چادروں تلے چھپنے لگے۔ رستم گھر سے باہر ایک چارپائی پہ بیٹھا کبھی چولھے میں سرد ہوتے انگاروں کو دیکھتا اور کبھی صاف آسمان پر سرگوشیاں کرتے تاروں میں الجھ جاتا۔

رات بھیگنے لگی اور وہ ننگی چارپائی پر سر کے نیچے دھوتی رکھ کر لیٹ گیا۔ نیند کوسوں دُور تھی...... شاداں اِس گھر سے اُٹھ کر پڑوس میں جا چکی تھی اور بدلے میں پتھر کی آنکھ والی بدّو کمرے میں بیٹھی رستم کا انتظار کر رہی تھی۔

کیسی انہونی تھی......!

رستم اِس سوچ سے بھاگ کر اپنی بھینسوں، کارخانے، اور لیاقت بابو کے خیالوں میں چھپ جاتا مگر بدّو کا خیال ایک خوف بن کر اُسے پھر سے دبوچ لیتا۔

رات کے پچھلے پہر اُس کی ماں اسے چارپائی سے اٹھا کر اندر لے گئی۔ رستم کمرے میں جا کر لیٹ گیا جہاں بدّو گٹھڑی کی طرح رنگین پائیوں والے پلنگ پہ پڑی تھی...... اس گٹھڑی کے گلے میں نیلے پیلے اور سرخ ریشمی دھاگوں اور سونے کی چڑیوں والی گانی پڑی تھی۔ رستم نے جب گانی دیکھی تو گھبرا گیا اور اسے اس بند گٹھڑی کی گرہیں کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ خوف زدہ سا، دم سادھے نیم تاریکی میں آنکھیں بند کیے جاگتا رہا...... نیم روشن اندھیرے کی اوٹ میں صدیاں گزر گئیں...... رستم پھر بھی سویا رہا۔

بدّو انتظار کر کر کے تھک گئی......

''رستم!''

آواز کو اندھیروں نے نگل لیا

''رستم! کیا تم سو گئے ہو؟''

''جی! ہاں جی۔''

پتھر کی آنکھ بھی رو پڑی...... رستم پھر بھی سویا رہا۔

فلم کا آخری شو بھی بکھر گیا......

کارخانے کو جانے والی سنسان سڑک کی دودھیا روشنیوں کے نیچے بوسکی کی قمیض، لٹھے کی کڑکڑاتی شلوار اور تلے والی تھوں تھوں کرتی کھیڑیاں پہنے...... دودھ کا کنستر اٹھائے ...... رستم آہستہ آہستہ گنگناتا جا رہا تھا

''اساں ایتھے نئیں رہنا بے گانیاں ملکاں تے''

□□□

مختاری

''مختاری ذرا جلدی آئیو گھاس کا گٹھا اُٹھوانا ہے۔''

''آئی ظفرے......''

ٹھمک ٹھمک چلتی مختاری ساتھ والے ظفرے کی پٹی میں جا پہنچی۔

''دیکھ ظفرے پچھم سے کیسی کالی گھٹا اُٹھ رہی ہے......لگتا ہے کہ آج تو یہ برس کے ہی رہے گی۔''

''ایسا نہ کہو مختاری......اگر چیت کے اخیر ایسی کالی گھٹا اُٹھے نا تو کسانوں کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں......ایسے کالے بادلوں سے تو اولے ہی برسا کرتے ہیں......مختاری! اگر یہ گھٹا برس پڑی نا تو تیار فصل پہ سفید چادر ہی بچھ جائے گی......دیکھ شیرے کی فصل کیسی لگی ہے......بالشت بھر بٹا ہے اس کا۔''

''اچھا ہے ظفرے! یہ گھٹا برس پڑے سب کچھ تباہ ہو جائے۔ میں تو کہتی ہوں اولوں کی بجائے آگ برسے......سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے۔ مُوا شیرا تو اپنا بھاگ بن کر رہ گیا ہے......پرسوں داؤ و چاچا شیرے کے باپ سے بات بھی پکی کر آیا ہے کہ اب کے فصل کی گہائی کے بعد......ظفرے تُو تو بڑا بزدل ہے......تُو سوچتا ہی رہ گیا......اور شیرے کا باپ داؤد چاچے سے دُعائے خیر کر بیٹھا......''مختاری روہانسی ہو گئی۔

''مختاری! داؤد چاچا نے کوئی گھاٹے کا سودا تو نہیں کیا۔ کہاں بیوہ ماں کا پُت اور

کہاں کرم گجر کا اکیلا شیرا......"

"تو ایسا کیوں سوچا کرتا ہے رے...... مختاری کے لیے اوپر سوہنا رب ہے اور نیچے تُو ہے۔ ظفرے! جب سارے راستے بند ہو جائیں گے نا تو ایک راستہ تو پھر بھی کھلا رہے گا۔"

"وہ کیا......"

"مختاری تیرے سنگ نکل کے جا بھی سکتی ہے۔"

"نہیں مختاری! داؤ و چاچا کی لمبی پگ ایک دفعہ بکھر گئی تو سنبھلنے نہ پائے گی...... سر سے کھسک کر یہی پگ گلے کا پھندہ بن جایا کرتی ہے...... چھوڑ فضول باتوں کو...... تاگے پہ تکیہ رکھ...... جمعرات کے جمعرات مزار پہ دیا جلا آیا کر...... شاید اسی طرح مقدر کا اندھیر کچھ کم ہو...... اور مختاری ہمیں اب یوں نہیں ملنا چاہیے۔ تُو کسی اور کی ہو چکی ہے...... جب گندم کی بنائی ہوتی ہے تو نیچے دار کی نظریں ایک ایک دانے کی رکھوالی کرتی ہیں......"

تمام راستہ دونوں خاموش کسی سوچ میں ڈوبے چلتے رہے۔ ظفرے کے کاندھوں پر رکھا گھاس کا گٹھا کبھی کبھی کھسک کر کمر تک پہنچ جاتا۔ ظفرا اُسے اوپر اچھال کر کاندھوں پر رکھ لیتا اور رفتار تیز کر لیتا۔

"مختاری! ذرا تیز چلنا...... بارش بھی آ رہی ہے اور بوجھ بھی زیادہ ہے......"

"ظفرے! جب تو اتنا بڑا گٹھا سنبھال نہیں سکتا تو اُٹھاتا کیوں ہے؟"

"تُو ساتھ تھی نا...... اس توقع پر میں نے یہ بوجھ اُٹھایا تھا...... مگر تو نے چپ چاپ منگنی کی انگوٹھی پہن لی...... داؤ و چاچا کرم گجر سے بات پکی کر آیا...... مختاری اب تیرے سنبھالے کی ضرورت بھی نہیں...... سامنے راجو کے کھلیان پر دم لے لوں گا......"

"دل والے دل اتنا چھوٹا نہیں کرتے۔"

ظفرے نے کھلیان پر پہنچ کر گٹھا نیچے اتار دیا اور اس سے ذرا سا لگا ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔

''مختاری! اس کھلیان سے ہماری راہیں جدا ہوتی ہیں۔ ہم دو الگ الگ راستوں کے راہی ہیں...... میں تنہا بھی ہاکا کیے لیتا ہوں...... تنگ پگڈنڈی ہے کہیں پھسل گیا تو تم تک میری آواز بھی نہ پہنچ سکے گی......''

''ظفرے! آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے...... مجھے قسم ہے اس کھلیان کی...... ان کھڑی فصلوں کی...... تیرے پیار کی...... یہ کھلیان آج سے ہماری یادوں اور وعدوں کا سنگم ہوگا۔ ہمارے راستے کبھی جدا نہیں ہوں گے...... افق پہ دیکھ...... زمین اور آسمان کا ملاپ ہمیشہ رہتا ہے......''

''مختاری! یہ محض ایک خیال ہے۔ ایسے نظر آتا ہے ورنہ اس میں حقیقت بالکل نہیں...... بلندیاں اور پستیاں کبھی نہیں مل سکتیں......''

''اس کے لیے زمانے کی دیواریں پھلانگنا ہوں گی ظفرے۔''

''مختاری! داؤ و چاچا کی حویلی کی دیواریں بہت اونچی ہیں...... اور ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں......''

بارش شروع ہوگئی...... دونوں اپنے اپنے راستے پر ہو لیے...... بارش ہلکی اور ہوا تیز تھی...... بادل بری طرح گرج رہے تھے۔ مختاری...... بادلوں سے اولوں کی آس لگائے اپنے گھر کی دہلیز پہ بیٹھی رہی...... مگر...... اللہ تعالی کالی گھٹائیں بغیر برسے واپس چلی گئیں...... کوئی اولے نہ برسے...... ہلکی ہلکی بارش ہوئی اور صبح سویرے ہی راجو کے کھلیان پر جھاڑ پھیر دیا گیا...... دو تین روز دھوپ لگی تو کھلیان تیار ہوگیا۔

مختاری روز شام منگے کے کھو والے گھڑے چھوڑ نانگا پیر کے مزار پر دیا روشن کرآتی...... ہزاروں دعائیں، تمنائیں اس کے من میں مچل اٹھتیں...... اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے مگر زبان ساتھ نہ دیتی۔ جب وہ دیے کی لو تیز کرتی تو آنسو اس کی گندمی، اداس آنکھوں میں تیر آتے...... کچھ دیر وہ قبر کے سرہانے خاموش کھڑی رہتی...... پھر کالے جھنڈے والے بانس کو زور زور سے ہلاتی...... کافی کو چومتی...... سفید پتھروں کے چکنے گول

گول لٹوؤں کو سر، منہ بلکہ پورے جسم پر پھیر ڈالتی اور پھر الٹے پاؤں زیارت کی چار دیواری سے باہر آ کر دروازے کی کنڈی زور زور سے کھٹکھٹاتی جیسے وہ ننگا پیر کی روحانی قوتوں کو جھنجھوڑ کر ہی دم لے گی...... وہ روز ارادہ کر کے جاتی کہ آج پیر بابا کے حضور اپنا مدعا پیش کرے گی مگر وہ تو لاج کی ماری صرف کالے جھنڈے والے بانس کو ہلا...... دروازے کی کنڈی زور زور سے کھٹکھٹا...... واپس لوٹ آتی۔

مختاری کو یقین تھا کہ ننگا بابا دلوں کے راز جاننے والا ہے۔ شیرا ابھی تو سارے راز جان گیا تھا۔

وہ مویشیوں کو چارہ پٹھا ڈال...... سر پر مڑوس باندھ...... ہاتھ میں موٹی سی لٹھ تھام، ہر شام کرازوں کے دھرم شالہ کے پاس تلئے پر بیٹھ گاؤں کے لونڈوں کی کھیل کبڈی دیکھنے جاتا...... وہ اکثر ظفرے کو چھیڑتا...... اُس سے الجھنے کے بہانے ڈھونڈتا...... کبڈی جیتنے پر داد دینے کے بہانے زور سے اُس کا ہاتھ دباتا......ظفرا صرف مسکرا دیتا...... کاندھے پر تھپکی کے بہانے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا "واہ جنیا! تیرا کھیل تو بہت اچھا ہے مگر تو کھیلتا بچوں سے ہے......"

کبھی کبھی دو چار بوڑھے اکٹھے ہو جاتے تو کبڈی کے مقابلے تیز ہو جاتے...... ٹھنڈی گھاس پر بیٹھے راجو، چاچا اور بھاجا شام ڈھلے تک اپنی بیتی جوانی کی یادوں کو کھنگالتے رہتے۔ اُن کی فرضی کہانیاں ناپختہ ذہنوں کے لیے ایک چیلنج بن جاتیں...... شیرے کو کسی کی باتوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی...... وہ ایک انجانی آگ میں سلگ رہا تھا۔

" کیوں بے شیرے...... مڑوس مار...... لٹھ اُٹھا تو یہاں کیا لینے آتا ہے...... کیا کسی سے لڑائی کرنی ہے۔ چل اُٹھ لنگوٹا باندھ...... میدان میں آ...... تُو نے تو کرموں کی دو بھینسیں چوس لی ہیں۔"

" چاچا! میرے مقابلے میں آئے گا کون......؟"

" ظفرا جو ہے" بھاجا چاچا ظفرے سے کافی متاثر تھا۔

"زینت کا پت مجھ سے کیا کبڈی کھیلے گا" سب لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔ اس روز ظفرے کومحسوس ہوا کہ یتیم ہونا بھی کتنا بڑا جرم ہے۔ مرے باپ کی اولاد کو ماں کے نام سے پکارا جاتا ہے...... وہ اداس سنجیدہ سا بھاجا چاچا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا......

"زینت کا پت" محرومی کے اس احساس میں سلگتا ہوا وہ بھاجا کے ساتھ نمبردار کے حجرے رک گیا...... اور کمرے کے کونے میں سرکنڈے کے موڑھے پر بیٹھ گیا۔

"چاچا! میں شیرے سے کبڈی ضرور کھیلوں گا...... اس نے میری عزت کو للکارا ہے...... چاچا تو ابھی جا...... اور جمعرات کی "گدھ" ڈال آ......"

بھاجا چاچا کی باچھیں کھل گئیں...... وہ خوب ہنسا...... ظفرے کی اس ہمت پر وہ بہت خوش تھا...... اس نے پوپلے منہ کو ہلایا نسوار کو دیوار پر تھوک دیا...... اور اپنے کھردرے کپکپاتے ہاتھوں سے ظفرے کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

"اے احمد کا بیٹا ہے نا! گوروں کے گورے نہ ہوں تو برگے ضرور ہوتے ہیں لا! مجھے چلم پکڑا"

بھاجے نے تیلے سے گندھی چلم کی نڑی اپنے ٹوٹے دانتوں کی درزوں میں دبا اتنے زور کا کش لیا کہ جلا تمبا کو بھی تلملا اُٹھا اور پھر وہ کھانستا...... چادر سنبھالتا...... حجرے سے چلا گیا...... مگر ظفرا نہ جانے کب تک اندھیرے حجرے میں بیٹھا ایک عجیب سے احساس میں سلگتا رہا......

بھاجا اگلی جمعرات کی گدھ ڈال آیا۔

دوسرے روز ظفرا کبڈی کے میدان سے سیدھا نانگا پیر کے مزار پہنچا وہاں مختاری اُسے مل گئی۔

"مختاری تو آج کل کھیت نہیں آتی...... داؤ چاچا نے منع کر دیا کیا؟"

"سنا ہے جمعرات کو تیری شیرے سے کبڈی ہو رہی ہے۔"

"ایسا ہی ہے مختاری! خدا کرے میں یہ کبڈی جیت جاؤں...... اگر شیرے کی ہار

ہوئی نا تو میں نانگا پیر کے مزار پر چادر چڑھاؤں گا۔ تو کیا شیرے کی جیت کے لیے دعا مانگنے آئی ہے......؟"

"ظفرے خدا کے لیے مجھے میرے باپ کے بکھیرے کانٹوں پہ نہ گھسیٹ...... میری دعائیں، میری فکریں، یادیں، میرا سب کچھ تیرے لیے ہے۔ لا ادھر بازو لا...... میں اپنے ہاتھوں سے نانگا پیر کے جھنڈے سے تیرا ڈولا باندھتی ہوں...... ان شاء اللہ فتح تیری ہوگی......"

مختاری نے اپنے دوپٹے سے گُڑ کی ڈلی کھولی اور ظفرے کے منہ میں ٹھونس دی۔

"لے خوردہ کھالے نانگا بابا کا......"

کسی مرد کے کھانسنے کی آواز آئی تو ظفرا جلدی سے زیارت سے باہر نکل آیا۔

اُس رات ظفرا چارپائی کوٹھے پر لے گیا۔ آج اُسے چاند ستارے نہ جانے کیوں عجیب سے لگ رہے تھے۔ وہ رات گئے تک جاگ کر سوچتا رہا کہ حالات نے کیسی نازک سی کڑیاں جوڑ دی ہیں۔ کیا مختاری میری ہو سکے گی...... مگر کیسے؟ اُس کی تو منگنی ہو چکی ہے۔ اُسے بھگا کر لے جاؤں؟ نہیں نہیں۔ میں اپنی بیوہ ماں کو بڑھاپے میں ذلیل نہیں کرنا چاہتا...... اُسے کتنا دکھ ہوگا۔ مختاری اور میری راہیں الگ الگ ہیں...... شیرے سے اس کی منگنی ٹوٹ نہیں سکتی...... اور فصل کی گاہی کے بعد مختاری اس کی ہو جائے گی۔

ظفرا اس سوچ سے بھاگ اُٹھا اور چاند ستاروں کی دنیا میں کھو گیا۔

جمعرات کی سہ پہر دھاتو نے نمبردار کے حجرے ڈھول جو بجایا تو پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ ظفرے کے سارے ساتھی پہنچ گئے تھے۔ کبڈی کی خبر دور دور گاؤں میں پہنچ گئی تھی۔ مقابلہ راجو کے کھیت میں تھا۔ سانگھڑوں کی ٹولی ڈھول شہنائیوں سمیت حجرے سے نکلی اور نانگا پیر کے تکیہ پہنچ گئی...... سلام کیا...... بشیرا مائیاں کی ململ کا شملہ باندھے...... دونوں ہاتھوں میں شنون کا سرخ دوپٹہ تھامے...... ڈھول کے آگے ناچتا ہوا میدان میں پہنچا...... پڑ باندھا گیا...... دو کوٹھیاں بن گئیں...... گبھرو جوان لنگوٹے باندھے...... سرسوں کے تیل میں

نہائے...... دیر تک اپنی اپنی کوٹھیوں میں ڈھول کی تال پر ناچتے رہے۔ نمبردار میدان میں آیا۔ چاروں طرف کھیت کے کنارے دُور دُور تک بیٹھے کبڈی پر قیاس آرائیاں کرتے لوگ چپ ہو گئے...... ڈھول کی بے سری تال نے بھی دم سادھ لیا...... نمبردار نے نوک دار چھڑی کا سرا دونوں کوٹھیوں کے درمیان گاڑ دیا...... ظفرا اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھے میدان میں اترا...... دونوں نے لمبی سُر میں "یا علی" کا نعرہ لگایا...... دھرتی کو چوما...... میدان کی مٹی کو مٹھی میں تھام لیا...... ظفرے کا ساتھی واپس چلا گیا...... ظفرا مسکراتا ہوا آگے میدان میں آیا...... اپنے پیچھے آنے والے شیرے اور اس کے ساتھی کی طرف مٹھی میں بند مٹی اچھال دی...... لوگوں نے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے...... ظفرا میدان کے دوسرے کونے پر پہنچ گیا تھا...... شیرا بھی اپنے حریف کے ساتھ لگا تھا...... ظفرے نے یک دم پلٹا کھایا...... شیرے کو جھانسہ دے کر...... اکبرے سے دو چار چھڑا اسے زور سے ایک تھپڑ رسید کیا اور واپس کوٹھی کو جو بھاگا...... ڈھول کی دھم دھم سے کوٹھی میں بھونچال آ گیا...... سانگھڑ پارٹی ناچتی کودتی میدان میں بکھر گئی...... شہنائی والے نے زور لگا لگا کر اپنے گلا پُھلا لیا...... دھاتو کے سر کی شملی بھی ڈھول کی تال پر ناچنے لگی...... ظفرا دس دس کے بیسیوں نوٹ تھامے ...... اپنی کوٹھی کے سامنے دیر تک ناچتا رہا...... سانگھڑوں کی کوٹھی سے ایک ایک کھلاڑی اپنی باری پر آتا...... کچھ پکڑے جاتے کچھ مار آتے یا آگے سے بھاگ آتے...... دوسری کبڈی پر ظفرا شیرے کے آگے سے بھاگ آیا...... باریاں الٹ گئیں...... شیرے کی پہلی کبڈی پر ہی ظفرے کی قینچی اور بازے کا کمہ کام کر گئے...... شیرا جھاڑی میں ایسا گرا کہ لہولہان ہو گیا...... دوسری باری سے پہلے ہی پڑ ٹوٹ گیا...... دھاتو ویلیں سمیٹتا ننگا بابا کے تکیے سے ہوتا نمبردار کے حجرے پر پہنچا...... رات دیر تک بھنگڑا اور بڑھکیں...... ویلیں اور ہنگامے......

کڑوے تیل اور ہلدی سے لپے روئی کے پھاہے...... شیرے کے زخموں کو اور بھیانک کر گئے...... شیرا سینے میں شکست کا ایک گھاؤ سمیٹے دو چار روز کے لیے گھر میں دبک گیا۔ ظفرے نے ننگے پیر کے مزار پر ریشمی چادر چڑھائی...... ڈولے کے بدلے سرخ

جھنڈا بانس سے باندھا اور چنبیلی کے تیل کی شیشی الماری سے نکال کر اونچی ڈھیر کو دو چار دیے مزار پہ روشن کر دیے۔

لُو تیز ہو گئی، فصلیں پک گئیں...... باقی ہنگامے سرد ہوئے تو فصلوں کی کٹائی زور شور سے شروع ہو گئی...... ہفتہ بھر پہلے سبز لہلہاتے کھیت پیلے پڑنے لگے...... ہوائیں تیز ہوئیں تو کنڈی پڑنے لگی...... بھاڑو نٹے پہ آ گیا تو دن رات ایک کر کے ساری فصلیں کٹ گئیں...... کھیتوں میں دُور دُور گندم کے بھاڑے نظر آنے لگے...... پھر جلد ہی گدھوں، بیل گاڑیوں اور اونٹوں پہ لدی گندم کھلیانوں میں پہنچ گئی...... کھلیانوں پر اُونچے اُونچے بھاڑے نمبر وار لگا دیے گئے...... راجو کے سنسان کھلیان پر زندگی سمٹ آئی۔ مختاری چلچلاتی دھوپ میں اپنی گندم کے بھاڑے کے سائے تلے کورے گھڑے سے ٹھنڈا پانی پی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتی...... شیرا گن گن کے دن گزار رہا تھا...... جب بھی وہ کھلیان کے پاس سے گزرتا...... مختاری کو دیکھ کر زور زور سے اپنے ڈینگرے کو چھڑی سے مارتا اور گندی گالیاں دیتا آگے بڑھ جاتا...... مختاری بُرا سا منہ بنا کر تھوک دیتی اور پھر سوچوں میں ڈوب جاتی...... فصل کٹائی سے دو چار روز بعد لوگ دَم لے کر گاہی میں لگ گئے...... کیکر اور پھلاہی کی بڑی بڑی شاخوں کو جوڑ کر بڑے گاہ کے پھلھے بنائے گئے...... رحمان ترکھان کی دکان پر رات گئے تک بتی کی روشنی میں ترینگل بنتے رہتے...... یسین لوہار کی بھٹی رات گئے تک کوئلوں سے اپنا سینہ جلاتی رہتی...... جیٹھ ہاڑ کی چلچلاتی دھوپ میں کھلیانوں سے گرد اور کڑی کے غول اُٹھتے...... بھوسے سے اَٹے کسانوں کے چہروں کی تھکاوٹ ایک ''شابش بر گیا'' کی آواز میں تحلیل ہو جاتی...... پھر وہ وگی چال شام ڈھلے تک پھلھوں اور بیلوں کے پیچھے ڈنگے والا چکا اُٹھائے جن کے سرے پر سرخ جھنڈی بندھی ہوتی بھاگتے رہتے...... بیسیوں بار فصل کو اُلٹ ڈالتے اور جب بھوسہ باریک ہو جاتا تو ترینگلوں سے سمیٹ دھڑ باندھ دی جاتی اور اسے نیروں کے جال سے ڈھانپ دیا جاتا اور پھر تُرے کے انتظار میں ترینگل لیے دھڑ کے سینے پر کھڑے ہو جاتے۔

دوپہر کو پتلی لسی، چپڑی روٹی اور چٹنی...... رات کو کورے گھڑے کا ٹھنڈا پانی اور نئے ڈٹے والی چلم ...... ایسے میں نہ جانے کتنے گیت اُبھرتے...... خالی گھڑے پہ انگوٹھی والے ہاتھ کی تھاپ سے ایک نیا رنگ اُبھرتا...... منان بنسری بجاتا تو بیسیوں لوگ راجو کے کھلیان اکٹھے ہو جاتے...... رات گئے تک خوب رونق رہتی ...... رات کے پچھلے پہر چاند دریچوں میں جھانکتا اور مختاری رات چاند ابھرنے تک جاگ کے سوچا کرتی کہ جب راجو کا کھلیان صاف ہو جائے گا...... بھوسے کی آٹھ آٹھ چارپائیوں کی مانیاں باندھ دی جائیں گی ...... نوپوں سے نئی گندم کالی جت کی بوریوں میں گھروں کو چلی جائے گی...... تو اس وقت مہندی کے پیلے رنگ سے اس کی قسمت کی لکیروں میں شیرے کا نام لکھ دیا جائے گا...... ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ ابھرتے لوک گیتوں میں اس کی سسکیاں رچ بس جائیں گی ...... وہ سرخ جوڑے میں ملبوس داؤد چاچا کا ہاتھ تھامے ڈولی میں بیٹھ جائے گی...... اور چاچا کتنی سفید مونچھوں میں گم ہوتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے اپنی لمبی پگ کو ڈھیل دے کر...... اس میں منہ چھپا کر کہے گا۔

''مختار بچی! آج سے تیرے لیے بابل کا گھر پرایا ہو گیا ہے۔''

تو نہ جانے کتنے ارمان اور حسرتیں داؤد چاچا کی لمبی پگ کے بلوں میں دب کر دم توڑ دیں گی...... اور وہ ڈولی میں بیٹھی شیرے کے گھر...... نہیں نہیں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

کھلیان پر بھاڑے آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے تھے۔ نمبردار کے گاؤں پر بیلوں کے جلسے کا پروگرام تھا...... علاقے کے دور دراز گاؤں سے بیلوں کی جوڑیاں منگوائی گئیں۔ حجرے کے ساتھ والی حویلی خالی کرا دی گئی صبح منہ اندھیرے ہی پولوں کو درانتی سے کاٹ کر کھلیان کا پڑ بنا دیا گیا۔ بیسیوں پھلّے بنائے گئے...... ظفرا اور شیرا آج پھر مقابلے پر آ گئے تھے...... دونوں کی جوڑیاں چوٹی کی تھیں...... گھنگروؤں اور ہاروں سے سجی جوڑیاں باری باری بھاگتیں...... کرسی اور گرو کے غول اُٹھتے...... دو دو آدمی پنجالی پر بیلوں کو سہارا دیتے...... اور

ایک مکھلے کے پیچھے بیلوں کی باگیں تھامے ہوتا۔
دھاتو اور ڈولسی کا نمکین کٹورا چڑھا...... ڈھول اور شہنائی کی لے پر مگن رہے......
دوپہر تک خوب رونق رہی...... پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا تھا...... دھوپ تیز ہوئی تو فصل تیار ہونے لگی...... آہستہ آہستہ جوڑیاں چکر سے باہر آتی گئیں...... آخری مقابلے کے لیے شیرے اور ظفرے کی جوڑیاں گاہ میں رہ گئیں...... دوپہر کے کھانے میں دال پیاز والی خمیری تندور کی چپڑی روٹی، پتلی لسی اور چٹنی......

''نمبردار جی...... لسی کے کٹورے کے ساتھ ایک مینڈک بھی پکڑا نا۔''

کیوں دھاتو...... کیا مینڈک بھی کھائے گا۔''

''نہیں نمبردار جی...... لسی ذرا پتلی ہے۔ بار بار سفیدی نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ مینڈک یہ کام خوب کرے گا۔''

'' بکواس کرتا ہے۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد مقابلہ پھر شروع ہو گیا...... آگے آگے شیرے کی جوڑی تھی...... پیچھے پیچھے ظفرے کی...... دوپہر ڈھلنے لگی...... دونوں جوڑیاں تھکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں...... چال میں ذرا برابر فرق نہیں آیا...... نعرے بلند ہوتے گئے رفتار تیز ہوتی گئی...... سہ پہر بھی ڈھل گئی معاملہ ہار جیت کا تھا اور کوئی بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا...... تماشائیوں میں شرطیں لگ گئیں...... شیرے کے حوصلے بلند تھے اور ظفرے کے بیل بھی آگے والے مکھلے سے منہ نہیں ہٹا رہے تھے۔

شیرے نے شوخی میں آ کر نعرہ لگایا...... ڈنگے والے چٹکے سے اُس کے بیل بدک گئے...... گاہ کے چکر سے باہر بھاگ پڑے...... جوڑی بے قابو ہو گئی...... پنجالی والوں نے بھی کندھا چھوڑ دیا...... باگیں شیرے کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں...... اور مکھلے سمیت بیلوں نے باگو والی چھپڑی پر جا کر دم لیا...... بیل پانی سے باہر نکلنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور شیرا شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا'' کیوں اوئے شیرے گھر ہے نا...... انھیں بھینسوں کا

دودھ پلاتا ہوگا اسی لیے بھینس کی طرح پانی سے باہر نہیں نکل رہے۔"

ظفرا شکست کا ایک اور گھاؤ شیرے کے سینے پہ چھوڑ گیا۔

حجرے سے متصل حویلی میں خوب رونق تھی...... صحن میں ستھر بچھا دیا گیا...... بڑے بڑے ٹوکروں میں تندور کی روٹیاں اور مٹی کی پراتوں میں دیسی گھی اور شکر سے کھانا دیا گیا...... گھی سے بھرے کوزے لیے بندے چوکی کے سر پر کھڑے رہے...... گھی کم ہوتا تو کوزے سے پرات بھر دی جاتی...... رات گئے تک حویلی میں خوب رونق رہی...... ظفرا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا...... اس کی جوڑی کی قیمت دو ہزار سے بھی اوپر ہوگئی تھی...... دوسرے روز ظفرا ننگا پیر کے تکیہ پر ایک اور چادر چڑھا آیا...... دو روز تک نمبردار کا اناج دانہ اس کے گھر پہنچ گیا...... منگل کو شیرے کی باری تھی...... اس کے بعد داؤ وچاچا، پھر انور اور آخری باری راجو کی تھی...... شیرے کا بڑے گاہ کا پروگرام تھا مگر جوڑی کے ہار جانے پر اس نے بڑے گاہ کا پروگرام ختم کر دیا۔

سوموار کی شام کو مختاری نے ظفرے کو کراڑوں کے مندر بلا بھیجا...... ظفرا آج کافی دنوں بعد مختاری سے ملا تھا...... اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا......

"مختاری میرے بیلوں کی قیمت دو ہزار سے بھی بڑھ گئی ہے...... اب کے شہر جا کر تیرے لیے بالیاں، چوڑیاں، کوکا اور خوب صورت گجرے لاؤں گا مختاری! تیرا شیرا تو میدان کا نکا...... میں نے اسے ایک بار پھر چاروں شانے چت گرا دیا ہے۔"

ظفرے! وہ موا میرا کیا لگتا ہے میرا سب کچھ تو تُو ہے...... ظفرے تو بہت سیدھا ہے...... تو اس عارضی جیت پہ خوش ہو رہا ہے...... آخری بازی تو ابھی باقی ہے...... اصل ہار جیت تو وہی ہوگی...... کل صبح شیرے کی گندم گاہی جائے گی اور اس کے بعد وہ مجھے بیاہ کر لے جائے گا...... سنا ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تُو اگر مرد ہے تو اب بھی موقع ہے کچھ کر لے...... ورنہ جو گجرے تو شہر سے میرے لیے لائے گا نا وہ خود ہی پہن لینا...... یا آج میرے منہ پر تھوک دے تا کہ باقی زندگی میں تیری سوچ کو بچے کی طرح اُٹھائے نہ پھروں......"

''مختاری! میں کر بھی کیا سکتا ہوں تجھے بھگا کر نہیں لے جا سکتا...... بیوہ ماں کو میں اس بڑھاپے میں ذلیل نہیں کرنا چاہتا......''

''تو شیرے کے بھاڑے میں آگ بھی نہیں لگا سکتا؟''

ظفرے کے وجود میں بجلی سی کوند گئی

''مختاری! تو کیا کہہ رہی ہے۔''

''ہاں ظفرے! فصل جل جائے گی تو شیرا! اس قابل ہی کہاں رہے گا۔''

''نہیں! نہیں! مختاری! میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''ڈرو نہیں حوصلہ رکھو! شیرا چاچے سے کہہ رہا تھا کہ وہ صبح سویرے ہی کھلیان پر جائے گا اور کام شروع کرے گا۔''

مختاری کو ظفرے نے ایک بار پھر اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا جیسے ابھی شیرا مختاری کو اس سے چھین کر لے جائے گا۔ آج ظفرے کا دل ڈوبا جا رہا تھا حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔ وہ وقت کے بھاری لمحوں کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ آخر کار اس نے فیصلے کا پتھر اٹھالیا۔

''مختاری! آج رات جب ستاروں کی چوکڑی نمودار ہوگی تو میں شیرے کے بھاڑے کو آگ لگادوں گا......''

شام ہی سے مختاری کے پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ داؤد چاچا سے عجیب اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی تھی۔ داؤد چاچا نے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا کہ اتوار تک دانہ فصل سنبھال کر شہر جائے گا اور اس کے لیے کپڑے گہنے لائے گا۔

مختاری چارپائی کو کوٹھے پر لے گئی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ آسمان صاف تھا مختاری چارپائی سے اٹھی اور سیڑھیوں سے نیچے جا کر گھڑونچی پر سجے کورے گھڑے سے ٹھنڈے پانی کے دو کٹورے چڑھا گئی۔

مشرق سے ستاروں کی چوکڑی نمودار ہوئی۔

''مختاری! جب ستاروں کی چوکڑی نمودار ہوگی تو میں بھاڑے میں آگ لگادوں

گا۔'' کھڑ کھڑاہٹ سے داؤ و چاچا جاگ گیا۔

''کیا بات ہے مختار بیٹی......''

''چاچا! گرمی ہے نیند نہیں آ رہی......''

گاؤں کے مشرق سے ایک شور سا اُٹھا۔ ایک تیز روشنی سی ابھری اور پھر آگ آگ کا شور مچ گیا۔ داؤ و چاچا بڑبڑا کر اُٹھا اور پگ گھسیٹتا، لپیٹتا کھلیان کی طرف بھاگا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ پورا گاؤں، عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے کھلیان پہنچ گئے ہر طرف آگ ہی آگ تھی ہوا بہت تیز تھی شیرے کا پورا بھاڑا جل چکا تھا۔ اب آگ داؤ و چاچا کے بھاڑے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ مختاری، داؤ و چاچا، نمبردار، شیرا، راجو، انور غرضیکہ سب وہاں موجود تھے اور ظفرا مختاری کے پاس کھڑا اپنے کیے کا ہولناک انجام دیکھ رہا تھا۔

''مختاری! یہ سب کیا ہو گیا ہے یہ کیسی آگ ہے۔''

مختاری نے منہ پھیر لیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ لوگوں نے آگ بجھانے کی پوری کوشش کی گھڑوں، بالٹیوں اور مشکوں میں پانی لایا گیا مٹی ڈالی گئی آگ ذرا سی دب جاتی مگر تیز ہوا سے شعلے پھر بھڑک اٹھتے......کھلیان پر ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔

شیرے کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ داؤ و چاچا اس آگ میں جل رہا تھا۔ مختاری کے گال بھی غصے سے سرخ تھے۔ آسمان صاف تھا۔ ظفرے نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈبڈبا گئیں۔ آسمان پر ستارے سرگوشیاں کرنے لگے۔ ستاروں کی چوکڑی اب کافی اوپر آ گئی تھی۔ ظفرا سوچنے لگا۔

'' کاش آج کالی گھٹا ہی برس پڑتی اولے ہی برس پڑتے۔ یہ آگ کسی صورت ٹھنڈی ہو جاتی۔ آگ جس نے داؤ و چاچا کے بھاڑے کے ساتھ ساتھ مختاری کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ظفرا پریشان حال، جلتے ہوئے کھلیان کو دیکھتا رہا اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ظفرے کو یقین تھا کہ مختاری اس کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا سکتی ہے مگر داؤ و چاچا

کے بھاڑے ساتھ مختاری کا پیار بھی جل گیا اور ظفرے کے لیے نفرت کی گرم گرم راکھ رہ گئی۔

دوسرے روز بھری پنچائت میں مختاری نے کہہ دیا کہ آگ ظفرے نے لگائی تھی۔ معاملہ پنچائت سے پولیس اور پولیس سے عدالت تک پہنچ گیا۔ ظفرے نے اقرار جرم کر لیا اور چھ ماہ کے لیے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا شیرے نے سب کچھ داؤ پر لگا کر مختاری کو جیت لیا تھا۔

جیل جا کر ظفرا مطمئن سا تھا مشقت کی طویل گھڑیوں سے اس کے ضمیر کے زخم مندمل ہوتے گئے۔ اب اس کے پاس مختاری کی دم توڑتی یادیں تھیں یا اس کے ہاتھ سے باندھا نانگا پیر کے جھنڈے سے پھاڑا ہوا ڈولا۔ شام گھنٹی کی آواز پر جب وہ اپنی بارک میں جاتا تو وہ گھنٹوں سوچا کرتا۔ اسے اپنی بیوہ ماں کی بے بسی اور بے کسی تڑپا دیتی۔ مختاری ایک بھیانک خواب بن کر اس کے اعصاب پہ سوار ہوتی گئی اور ایک چڑیل بن کر اس کے خوابوں کو اذیت ناک بناتی رہی۔

مختاری کی وجہ سے ظفرا جیل چلا گیا تھا مگر شیرے کا گھر بھی مختاری کے لیے جہنم سے کم نہ تھا۔ وہ اکثر مختاری کو پیٹتا اسے ظفرے سے یاری کے طعنے دیتا۔ مختاری اکیلے میں آنسوؤں سے اپنے ملول دل کو دھو ڈالتی۔ ظفرے نے بھری پنچائت میں مختاری کا ذکر کیے بغیر مردوں کی طرح سارے الزام اپنے سر لے لیے تھے۔ یہ سوچ ایک کسک بن کر مختاری کو تڑپانے لگی۔

زندگی کی کڑی دھوپ میں وہ بالکل تنہا کھڑی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ کبھی کبھی وہ رات کو چھپ کر نانگا پیر کے مزار پر جاتی وہاں ظفرے کی اُداس، سوگوار ماں کو دیکھ کر ٹھٹک سے رہ جاتی۔ وہ یہاں قبر کی کافی سے لگی آنسو بہاتی، ماتھا رگڑتی دعائیں مانگتی، جھنڈے چڑھاتی، مزار کے باہر دروازے کی کنڈی اتنے زور سے کھنکھناتی کہ تاک سے چمٹی دیمک کے گھروں کی مٹی بھی جھڑ جاتی مگر مختاری کو یوں محسوس ہوتا کہ یہ پیر نانگا کا مزار نہیں شیرے کی قبر ہے۔

تین ماہ گزر گئے۔ ظفرے نے سارے احساسات، تصورات کُھرپے سے کیاریوں میں دفن کر دیے تھے مگر سوچ میں اس کی ماں کا وجود، بیوگی کے بکھرے ہوئے سفید بالوں، آنسوؤں سے تر جھریوں بھرے چہرے، کھلی باہوں سے اُس سے کچھ دور اسے ملنے آتا۔ جب وہ اسے چھونے کی کوشش کرتا تو وہ ریت کی مورتی کی طرح بکھر جاتا۔ وہ یہ امید لپیٹ کر سو جاتا کہ صبح ماں ملاقات کرنے آئے گی مگر شام کو جب باقی قیدی اپنے ملاقاتیوں کا ذکر کرتے اور ان کی لائی ہوئی چیزیں ظفرے کو دیتے تو وہ اس کم سن بچے کی طرح رو پڑتا جو بھیڑ میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہو۔ وہ بھیگی آنکھوں سے سو جاتا۔ امید کے انبار سے اُٹھتا مگر پھر شام کو ناامیدی کی قبروں میں دفن ہو جاتا۔

پھر ایک روز اس کی ملاقات آ گئی وہ بہت خوش تھا۔

اس روز ملاقاتیوں کا بہت رش تھا۔ جالی کے پیچھے اندھیرے سے ایک ہیولا سا سلاخوں سے لگ گیا۔

ماں! ظفرے کی آواز گلے کے اندر ہی ٹوٹ گئی۔

"ماں! میں بے قصور ہوں۔ یہ آگ میں نے نہیں مختاری نے لگائی تھی جس سے تیرا پورا گھر جل کر راکھ ہو گیا ہے" ظفرا بلک بلک کر رو پڑا۔

"ماں! مجھے معاف کر دے میں نے تجھے بہت دکھ دیے ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو آگ مختاری نے نہیں تم نے لگائی تھی۔"

ظفرا چونک گیا۔ گھونگٹ اُٹھا۔ وہ مختاری تھی۔ پریشان حال، بال بکھرے ہوئے، آنکھوں میں آنسو، چہرے پر ایک گہری سرخی، ظفرا سلاخوں سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"مختاری! تو یہاں کیسے آ گئی اس جیل میں؟ میرے پاس کیا رکھا ہے جو لُوٹنے آ گئی ہو......؟"

"مختاری! تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟ چہرے پہ یہ سرخی کیسی؟ بکھری زلفیں کیسی...... یہ کیسی آگ ہے، یہ کیسی برسات ہے، یہ کیسی کالی گھٹائیں ہیں۔ نہیں مختاری ایسا

نہیں ہو سکتا۔ جب کھلیان میں آگ لگتی ہے تو کوئی گھٹا نہیں اُمڈتی، کوئی بارش نہیں برستی۔''

''ظفرے! مجھے معاف کر دو تا نگا پیر کی سونہہ...... میں آج بھی تیرے لیے دعائیں مانگتی ہوں۔ میں آج بھی تیرے لیے زندہ ہوں ورنہ میں کب کی کھوہ میں چھلانگ لگا کر مرگئی ہوتی۔ شیرا مجھے تنگ کرتا ہے...... روز مارتا ہے...... تیرے پیار کے طعنے دیتا ہے...... ظفرے! میں نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔''

''مگر تو یہاں آئی کیسے؟''

''شیرا دو روز کے لیے شہر گیا ہے ظفرے! میں تم سے ایک مشورہ کرنے آئی ہوں تو کہے تو میں شیرے کو زہر دے دوں؟''

''مختاری! میں سمجھتا تھا کہ تیرا پیار اَمر ہے۔ نہیں...... مختاری! تیرا پیار کھلیان پہ بکھرا اناج ہے...... جس میں ایک دفعہ آگ لگ جائے تو سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔''

اور پھر شیرے نے میرا کیا قصور کیا ہے کہ میں ہر بار اس کے بھاڑے کو آگ لگا دوں۔

''جا مختاری! واپس چلی جا...... میں شیرے کے گھر کو آگ نہیں لگانا چاہتا۔''

اعتراف

اُس نے چوڑیاں چھناک سے توڑ ڈالیں...... کانچ کے نیلے پیلے ٹکڑے فرش پہ بکھر گئے...... اور اُن کی مہین مہین کرچیاں مجھے دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں...... میرے سینے وقار اور جھوٹی اَنا کا وہ بت ٹوٹ گیا...... جو میں نے وقت اور سوسائٹی کے گراں بار تیشوں سے تراشا تھا...... آنکھوں کے بندٹوٹے...... تو پلکوں پہ شبنم مسکرانے لگی۔

وہ مجھے اِن کیچڑ بھری گلیوں میں ملی تھی۔

وہ دھرتی کا دُکھ تھی۔

وہ دھرتی کا بوجھ تھی۔

اور......

اِس دھرتی کے خدا مجھ جیسے انسان تھے......

لیکن میں نے اُس کی خوب صورت آنکھوں میں گنگا جمنا کے جَل کا سا تقدس دیکھا...... اُس کی چال میں نیل کا سا وقار دیکھا۔ اُس کے قہقہوں میں جھانجروں کے سنگیت سنے۔ اُس کی نیلگوں آنکھوں کی سُندر گہرائیوں میں تیرتے ہوئے معصوم دُکھ دیکھے...... اُس کے بکھرے اُلجھے بال...... صحراؤں کے سینے...... اُبھرتے...... ڈوبتے...... اُس کی خوب صورت مخروطی اُنگلیاں...... کسی شیشہ گر کی دکان میں ہیرے سے کٹی آئینے کی کرچیاں...... بے لکیر...... جن میں ہر کوئی اپنی قسمت جھانکتا پھرتا ہے...... اُس کا خمار آلود سا بوجھل بوجھل

احساس...... خدا کی قسم...... وہ بہت ہی خوب صورت...... ہارے جواری کے بھگے سپنوں سے بھی خوب صورت...... پھر بھی وہ دھرتی کا دکھ...... دھرتی کا بوجھ......

اور...... میں ایک انسان......

میں اُس بوجھ کو اُٹھانے کے لیے جھکا......

وہ مجھ سے لپٹ گئی......

میں نے اُسے محسوس کیا......

''تمہارا نام......''

''میرے بیسیوں نام ہیں...... آپ مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں......''

''میں تم کو ''گُڈی'' کہہ کے پکاروں گا......''

''مگر وہ تو کاغذ کی ہوتی ہے......''

''صاب! مجھے مشین کے تیل کی چپچپاہٹ سے سخت گھن آتی ہے......''

اُس نے مشین بند کر دی...... اور مشین پر رکھے اُلجھے سُوت سے دھاگوں کے کچے کچے ڈورے کھینچنے لگی...... اور میں سوچوں کے کچے کچے ڈورے جوڑنے لگا تو اس طویل ڈور کے سرے پہ اُلجھی ''گُڈی'' مجھے مستقبل کے اُفق پہ تنی نظر آئی...... تو میں چونک گیا......

''کہیں کچی ڈور ٹوٹ ہی نہ جائے...... کٹی پتنگ جانے کہاں جا نکلے گی......''

''صاب......!''

''ہاں! کیا بات ہے......؟''

شیشے کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا...... وہ مسکرائی۔ میں نے اس کی مسکراہٹ میں تیل کی چپچپاہٹ کو محسوس کیا...... ایک پھسلن کو محسوس کیا...... میں لڑکھڑا گیا...... اونٹ کی طرح میں پھسلن کا بہت ہی کم زور ہوں...... پھسل تو میں بازار کے اُس گندے نالے کے کنارے بھی گیا تھا...... اگر وہ شخص مجھے سنبھالا نہ دیتا...... تو دن کے اُجالے میں مَیں اُن غلاظتوں میں گر جاتا......رات کی تاریکیوں میں تو غلاظتوں کی کراہت کا احساس ہی نہیں

ہوتا۔ نظروں کی آنچ سے یہ احساس سلگ اُٹھتا ہے...... اور میں لوگوں کی نظروں کے الاؤ سے بچ کر ''گڈی'' کو لوٹ لینا چاہتا تھا...... کیوں کہ آنے والی بسنت میں وہ کٹ تو جائے گی...... جانے کتنے ہاتھوں میں بٹے گی...... اُس کا وجود بھی رہے گا یا نہیں...... میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ وہ زخم خوردہ ہے...... بوچڑی کے پاس چھیچھڑوں پر پلنے والے گدھوں نے تو ایک زخم خوردہ گائے کو زندہ ہی نوچ ڈالا تھا...... میں اگر اُس کے گھائل جسم سے ایک بوٹی نوچ لوں گا تو کیا فرق پڑے گا مگر میں یہ کیسے تصور کر لوں......

میں نے اُس کے چہرے پر زخموں کے کرب نہیں دیکھے...... میں نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ وہاں مجھے لُٹے مسافر نہیں، نئی منزلوں کے راہی نظر آئے ہیں...... یہ بھی ممکن ہے...... کہ اُس کے کردار کی مسخ لاش کو وقت کے تراشے پتھروں کی خوب صورت قبر میں دفن کر دیا گیا ہو...... اور میں قبروں کو اُکھیڑ کر ماضی کے تاریک خانوں میں روشنیوں کو تلاش نہیں کرنا چاہتا...... اور نہ میں مصلحت کی دیوی کے چرنوں میں عقیدت کے پھول چڑھ جانے کا قائل ہوں۔

میں تو وقت کا راہی...... کبھی رات کھلے آسمان کے نیچے...... کبھی کسی تاریک سرائے میں بسیرا...... بے منزل...... بے ارادہ...... بے تھکن...... یوں ہی چل رہا ہوں...... میکانکی انداز سے میرے قدم اُٹھتے رہتے ہیں...... مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حالات کا سٹیم انجن مجھے دن رات کی ان سلسلہ وار لائنوں پہ دھکیلے چلا جا رہا ہے...... میرے احساسات...... میرے جذبات...... میری سوچیں...... میری خواہشیں ایک گناہ کی طرح انجن سے جکڑی اُس کی داشتہ بوگی کے شکم میں کلبلا رہی ہیں...... جانے ضابطوں اور اصولوں کی ڈور ٹوٹے گی بھی یا نہیں...... اس طویل قطار میں میری باری کب آئے گی...... گزرتے وقت کی گاڑی کے بھاری پہیوں کے نیچے دبے بھکاری کی طرح کہیں میں بھی تہی دست ہی نہ مر جاؤں...... میرا تو کئی بار لُٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔

''کاش کوئی میرے اصولوں کو لوٹ لے...... میرے جسم سے میرے وقار کا چیتھڑا

ہوا وہ بوجھل لباس نوچ لے ...... کہ میں ننگا ہو جاؤں ...... ضابطوں کی دیوار گرا دے، گھٹن کچھ تو کم ہو ...... وہ پگلی پھر بھی مجھے ''صاب'' کہہ کر پکارتی ہے ...... اسے اصول کتنے عزیز ہیں ...... نہیں ...... وہ تو ضابطوں کی آہنی زنجیروں میں جکڑی وقت کے فرعون کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہے ...... اور میں اتنا ذلیل ...... کہ اس سے اپنے ذہن میں اُبلتے ایک جنسی جذبے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ...... لیکن جرأت کے بھاری پتھر کون اُٹھائے گا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم ایک دوسرے کے جذبوں کی گونگی زبان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ...... وہ مجھ سے تیل کی چپچپاہٹ کا ذکر تو کر سکتی ہے، لیکن اس حد سے آگے پھسلن پر سے اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتی تو سوت کے کچے ذوروں میں جا اُلجھتی ہے ...... اور اکثر میں بھی ضابطوں کی اُلجھنوں سے گھبرا جاتا ہوں ...... میں کئی بار چاہتا ہوں ...... کہ اس کی مشین کو چلتا چھوڑ کر اُسے ضابطوں کی ان دلدلوں سے دُور لے جاؤں ...... صدیاں گزر جائیں ...... اس وقت تک لوٹ کر نہ آؤں جب تک یہ مشینیں تھک کر نہ سو جائیں ...... ان کا احساس نہ مر جائے ...... لیکن یہ مشینیں نہیں مر سکتیں ...... ان کا مضبوط آہنی جسم ...... زنگ کے سوکھے ہوئے ناسور ...... گاڑھے سیال تیل سے لتھڑی مشینیں ...... وہ ان زخموں میں بھی مسکراتی ہے اور یہی اُس کی عظمت ہے۔

میں کبھی کبھی اس کے لیے ایک خوش گوار سے جذبے کو بھی محسوس کرتا ہوں ...... وقت کے طویل بازوؤں اور مشین کے اکتا دینے والے یک سُو بوجھ سے ابھی جب وہ تھک جاتی ہے ...... اور مجھے دیکھ کر وہ معصوم سی مسکراہٹوں میں گھل جاتی ہے ...... تو اس مریم کو دیکھ کر میرا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

''میں اس مریم کا پجاری ہوں ...... اس کے ناکردہ معصوم گناہوں کے الزام مجھے دے دو کہ میں سرخرو ہو جاؤں۔''

سوسائٹی کا آمران معصوم سوچوں کے جرم کی پاداش میں ضابطوں کا پھندا میری گردن میں ڈال دیتا ہے ...... میں کرب کی سولی پہ لٹک جاتا ہوں ...... اس کی مسکراہٹیں

میرے ماتھے کی شکنوں میں گم ہو جاتی ہیں...... اور اداسی سے لتھڑے احساس سمیت وہ گھر واپس چلی جاتی ہے...... راتوں کو تو زخموں کے چراغوں کی لو اور تیز ہو جایا کرتی ہے......

مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں اس کے دکھوں کو محسوس کرتا ہوں مگر اقرار کی کوئی باقاعدہ قرارداد پیش نہیں کر سکتا...... میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اسے سختی سے منع کر دوں کہ ہم مختلف سٹینڈرڈ کے پرزے ہیں جو ایک مشین میں نہیں جوڑے جا سکتے...... تم مشینوں کے اس دیس میں مشینوں سے ہم آہنگی پیدا کرو...... تم ڈیلی ویجز کی مزدور ہو...... ہر شام تمہاری قیمت لگا دی جاتی ہے...... اور جس روز کام نہیں ہوگا...... تمہیں گھر واپس جانا ہوگا...... ممکن ہے کہ تم مہینوں بعد اپنے پیار محبت اور خلوص کے انمول جذبوں کا کارڈ لے کر جاؤ تو اجرت بورڈ کے دفتر کی کھڑکی تمہیں بند ملے...... میری مانو...... تو ہر لمحے کی قیمت چکاؤ اور ہر لمحے اسے وصول کرو...... تمہارے دکھ...... تمہارے آنسو...... تمہاری مسکراہٹیں...... بڑی انمول ہیں...... تمہارا خلوص اور میری بے رخی...... جب پھر بھی تم مسکرا دیتی ہو تو میں اپنے آپ کو بہت گھٹیا اور گرا ہوا محسوس کرتا ہوں......

وہ نہ جانے مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتی ہے۔ میں نے کئی بار اس کے لرزتے ہونٹوں پر خاموش آرزوؤں اور التجاؤں کو سسکتے دیکھا ہے......

''آؤ...... میرے قریب آؤ......''

''میرا ہاتھ تھام لو......''

''میرے چہرے پہ دکھوں کے اشتہار دیکھ کر گھبرا کیوں گئے ہو۔''

''میں تم سے کوئی وچن تو نہیں لیتی...... میں نے تو تمہیں سپنوں میں دیکھا ہے......''

''آؤ اور سیتا کو وقت کے راون سے چھین لو......''

''جیون کی کھردری راہوں پر میں لڑکھڑا گئی ہوں...... مجھے سہارا دو۔''

''میری تصویر اپنے بٹوے میں سجا لو اور صرف اپنی جیب میں رکھو۔''

''میری مورتی کو اس عجائب گھر کے شیشے کے شوکیسوں سے چرا کر لے جاؤ اور

اپنے ڈرائنگ روم کی کارنس پر سجادو۔ میری تاریخ کی تختی اُٹھا کر کسی کوڑے کے ڈرم میں پھینک دو۔ یا اُس فن کار کا خون کردو کہ جس نے پتھر کو میرے وجود کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ہو سکے تو دوسرے مجرم کو بھی تلاش کرو...... جس نے کھنڈروں کے سینے چیر کر میری مورتی کو سرِ بازار نیلام کیا ہے...... اور مجھے شیشے کے قید خانوں میں دھکیل دیا ہے، جس کی دہلیز پر رکھی تختی نے میرا لباس نوچ لیا ہے۔"

"تم اگر کوئی فن کار نہیں تو ایک گورکن بن کر میرے وجود کو اپنے گھر کے آنگن کے کسی کونے میں دفن کردو...... لیکن سنگِ مرمر کا کوئی کتبہ نہ لگانا...... ہو سکے تو عقیدت کے کچھ چراغ روشن کر دینا کیوں کہ میں صدیوں سے پیاسی ہوں......"

"تم!...... میں نے زندگی کے سمندر کی بے رحم موجوں کے اُس پار روشنی کا ایک مینار دیکھا ہے...... خیال رکھنا...... سپنوں کے یہ گھروندے ٹوٹ ہی نہ جائیں...... مجھے بچپن کے وہ کھیل تماشے یاد ہیں کہ جب پَپّی کا بنایا ریت کا گھروندا ٹوٹ گیا تھا...... تو سلمٰی کے گڈے سے پَپّی کی گڑیا کی جھوٹ موٹ کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی...... تو پَپّی نے اُس شکستہ گھروندے کی مٹی تلے گڑیا کو دفن کر دیا تھا......"

میں نے اُس کی سسکیاں سن لی ہیں...... حالاں کہ میں بہت گھٹیا اور گرا ہوا انسان ہوں...... میرا سایہ تو اس لیے طویل ہے کہ میری پشت پہ سورج پستیوں کو چھو رہا ہے ورنہ افق پہ خون سے لتھڑے مقتل پہ دم توڑتے سورج کی طرف میں ایک بار بھی رُخ کرلوں...... تو شرم کے مارے میرا سایہ میری پیٹھ پیچھے جا چھپے گا...... میں اپنی حیثیت جانتا ہوں...... اور اس جنون سے ٹکرا کر اپنے کھوکھلے بھرم کی اس دیوار کو نہیں گرانا چاہتا...... جس کے پیچھے میرے ضمیر کی بے گوروکفن لاش گل سڑ رہی ہے...... وہ پگلی پھر بھی مجھے پیار کرتی ہے...... شاید اس لیے کہ وہ دیوار کے اس پار نہیں دیکھ سکتی۔ میں کچھ بھی سہی...... کبھی کبھی میں بھی اُسے شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

ایک روز میں اُس کے پاس جاتے ہی پھٹ پڑا......

''گڈی! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو......''

''جی......!''

''جی صاب! آپ کو......''

''صاب! آپ بہت اچھے ہیں......''

وہ اناڑی مداری کی طرح لڑکھڑائی اور نانگ کے جھولتے رسے سے نیچے آن گری...... نیلی جھیل اُبل پڑی...... اور مشین کے تیل کی پرسکون سطح پر کچھ موتی تیرنے لگے...... اور میں اس کی آنسو بھری مسکراہٹوں کا کرب سمیٹے اپنے اندر کو لوٹ آیا......

''جذبات کسی کے بھی ہوں وہ مقدس ہوا کرتے ہیں...... میں کئی بار چاہتا ہوں کہ اُس کے پاس جاؤں...... اور اُسے سستے سے انداز میں نغموں اور بہاروں کا واسطہ دوں...... اُسے تاریک تنہائیوں میں ملوں...... اپنے افسانوں سے بھی طویل اُسے خط لکھوں...... پارک کے کسی کونے میں بیٹھ کر گھنٹوں اُس سے باتیں کروں...... کہرآلودہ شاموں اور چاندنی سے لپٹی راتوں سے بھی حسین باتیں...... اور پھر فریب کے ایک نیم تاریک سائے تلے صدیاں گزر جائیں...... باتیں پھر بھی ختم نہ ہوں...... جوانی کی شام ہوتے ہی میں زندگی کے اندھیروں میں گم ہو جاؤں...... وہ مجھے پکارتی رہے...... میں کبھی واپس نہ آؤں...... بڑھاپے کی دہلیز سے میرا جنازہ اٹھے اور مجھ سے کٹ کر اس کی جوانی ایک سوگوار داغ بن جائے......''

کبھی کبھی میں خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہوں...... معلوم نہیں مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جو وہ مجھے اتنا چاہتی ہے...... سچ تو یہ ہے کہ مجھے تو صحیح طریقے سے جینے کا انداز بھی نہیں آتا...... مگر کچھ لوگ تو یوں ہی کسی نہ کسی سے پیار کرتے ہیں...... اور وہ لوگ عظیم ہوتے ہیں...... اور یہ لڑکی...... جس پارک میں بیٹھا میں یہ کہانی لکھ رہا ہوں...... اس پارک کے احاطے کی خاردار تار سے ایک بیل لپٹی ہوئی ہے...... اس کا جسم زخمی ہے...... لیکن اس کے خوب صورت پھول مسکرا رہے ہیں...... اور میں خار دار وجود کا ایک سستا سا آدمی ہوں...... میں تو صرف یہ چاہتا ہوں...... کہ حال کی رنگین روشنیوں کے سائے تلے...... جوانی کے

نغموں کی لے پہ ہم ناچتے رہیں...... میں تھک جاؤں تو ساز ٹوٹ جائے...... روشنیاں گل ہو جائیں...... ہمارے ہاتھ چھوٹ جائیں...... ہم اندھیروں میں بچھڑ جائیں...... سالوں بعد ملیں تو انجان سے اور اپنے اپنے بچوں کی انگلیاں تھامے یوں گزر جائیں جیسے کبھی آشنا ہی نہ تھے...... گرد آلود جلد والی البم میں تصویریں کون ڈھونڈتا پھرے گا...... زندگی تو حال کی ڈگر پہ چلتی ہے...... اور میرا ماضی...... خوب صورت جلد والی تصویروں کی وہ البم ہے جس کی سینکڑوں دیواریں ہیں...... اور ہر سیاہ دیوار پر ایک لڑکی کی تصویر چسپاں ہے...... اور میں اتنی دیواریں نہیں پھلانگ سکتا......

جو کچھ زیرِ تحریر ہے...... یہ منفی انداز میں سوچنے والے ایک منتشر ذہن کی تخلیق ہے...... ورنہ یہ حقیقت ہے۔ میں لفظوں کو ترتیب دے سکتا ہوں...... خوب صورت کہانیاں لکھ سکتا ہوں...... مگر مجھے اُس سے بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا...... نہ تو میں بھکاری کی طرح اس سے کچھ مانگ سکتا ہوں...... اور اُسے کچھ دینا چاہوں تو میری بھوکی جیبیں میرے ہاتھوں کو نگل لیتی ہیں...... میں اسے میٹھے الفاظ بھی نہیں دے سکتا......

''کہو گڈی کیسی ہو؟''

''جی رہی ہوں......'' نغمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

''کل ڈیوٹی کیوں نہیں آئیں......''

''جی کچھ اچھا نہیں تھا......'' زخم رسنے لگتے ہیں۔

''مارکیٹ میں پرسوں رات تمہارے ساتھ کون تھا......؟''

''جی! ...... کوئی بھی تو نہیں تھا......''

مجھے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں اس کی توہین پہ اُتر آیا ہوں۔ اس کے چہرے پہ کرب اور اس کی آنکھوں میں شبنم اُمڈ آتی ہے...... وہ بات بات پہ رو دیتی ہے...... شاید وہ یہ نہیں جانتی کہ پتھروں سے گھنٹیاں تو بجائی جا سکتی ہیں مگر ان کے سینوں سے نغمے نہیں پھوٹ سکتے۔

اُس شام وہ مجھے فٹ پاتھ پر مل گئی۔

''گڈی! آج مجھے اپنے گھر لے چلو.......''

''ماں کیا سوچے گی.......؟''

''وہی جو لوگ کہتے ہیں.......''

وہ خاموش....... گم صم چلتی رہی....... میں چونک گیا۔ اس نے سوچوں کا یہ انداز کب سے سیکھا تھا....... وہ سراپا جنون تھی....... میں نے اس کے ہاتھ میں بھاری ہوتے بنڈل تھام لیے۔

''گڈی! اپنے دکھ....... اپنے غم....... اپنے بوجھ مجھے دے دو.......''

وہ خاموش رنجیدہ سی چلتی رہی۔

''اگر تم یہ نہیں چاہتیں کہ میں تمہارے گھر جاؤں....... تو تمہارے گھر کی دہلیز سے واپس آ جاؤں گا.......''

''اور میرے یہ دُکھ....... اور یہ بوجھ.......''

''یہ تم کو لوٹا دوں گا.......''

''نہیں....... نہیں....... ایسا کبھی نہ کرنا.......'' وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔

''تمہاری ماں.......''

''وہ شاید ابھی کام سے واپس نہیں آئی.......''

چھوٹے سے اُس گھر کے ایک روشن سے کمرے میں مَیں بیٹھ گیا....... وہ چائے لے آئی۔

''سراج صاحب! میں کس قدر تنہا ہوں....... اپنا کوئی بھی تو نہیں....... ایک ماں ہے....... یا آئس فیکٹری کی طرح سرد، ویران، اندھیرا یہ گھر ہے....... شفٹوں میں مَیں اور میری ماں اس گھر میں آتے ہیں''

گڈی باورچی خانے چلی گئی۔ میں کمرے کی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ سامنے دیوار

پرسادہ فریم میں ایک پرانے طرز کے گرجے کی تصویر تھی جس کی عمارت کی بوسیدہ دیواریں کائی کی تہہ سے لپی ہوئی تھیں .... اور گرجے کے سامنے دکانوں کی جھکی چھتوں کے نیچے چھجوں سے گلی میں جھانکتے ہوئے لوگ .... گلی میں بھی عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک ہجوم سا تھا....... خاموش انسانوں کا وہ قافلہ شاید خدا کی تلاش میں نکلا تھا....... گرجے کے بھاری بھرکم دروازے بند تھے....... اور عمارت کے ماتھے پہ کافی کی طرح اُنھی صلیب پر برف مصلوب تھی .... اور پتھر پہ کُھدی تصویر میں یسوع مسکرا رہا تھا....... میرے دیکھتے ہی وہ تصویر بول پڑی۔

''میرے بیٹو! ان بھاری بھرکم دروازوں کو بند رہنے دو....... میں یہ جانتا ہوں کہ تم معصوم ہو....... تمہارے چہرے تو محنت سے تھکے ہوئے ہیں....... تمہاری آنکھیں تو نیند سے بوجھل ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سکون کی تلاش میں ہو....... میری مانو....... واپس لوٹ جاؤ....... اگر خدا کو تلاش کرنا ہے....... تو انسانوں میں تلاش کرو.......''

تصویر خاموش ہوگئی۔

آسمان پر گہرے بادل اور سیاہ ہوگئے۔

شام رات کی گود میں سمٹ گئی

بادل اندھیرے میں اُتر کر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کو پیٹنے لگے.......

خوف کے مارے میں نے پردے نیچے گرا دیے.......

گہری سرخ آنکھوں والی تصویر مجھے گھورنے لگی۔

رات بھیگ گئی.......

رات تاریک ہوگئی۔

اور ہم دونوں گناہ کے ایک آہنی احساس تلے دبتے چلے گئے....... شمع جلتے ہی پگھل گئی اور ہم اندھیروں میں ڈوب گئے....... تصویریں چیخ اٹھیں تو تنہائیوں نے ان کا گلا گھونٹ دیا....... مارتھا کی لاش پہ ہوائیں رات بھر ہچکیاں لیتی رہیں....... اور آنسوؤں میں بھیگی

رات ایک معصوم بچے کی طرح سحر کی بانہوں میں سو گئی...... لیکن تصویر میں یسوع رات بھر جاگتا رہا...... صبح وہی تصویر دیکھی...... چرچ کے دروازے کھلے تھے۔ لوگ بوجھل قدموں سے چرچ میں داخل ہو رہے تھے...... یسوع بہت سوگوار تھا۔

''میرے بیٹو! آؤ خدا کے گھر میں داخل ہو جاؤ...... دروازے مَیں نے اس لیے کھول دیے ہیں...... کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو...... تم گناہوں کے بوجھ اُٹھا کر لائے ہو...... عظیم باپ بڑا مہربان ہے۔ اُس کے سامنے جھک جاؤ...... اعتراف کرو اپنے گناہوں کا۔''

چرچ کے کونے میں مریم کے پتھر کے بُت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے......

□□□
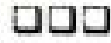
کل کی بھیگی آنکھ

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہے۔ آج کے جھروکے سے میں کل کو ماضی کے اُفق پر تا حدِ نظر دیکھ بھی سکتا ہوں...... اور کل...... وہ تو اندھی ہے...... اور آج کے قدموں کی چاپ پر چپ، خاموش، دھیرے دھیرے غیر محسوس سے انداز میں چلی آرہی ہے...... کل کی مسافت تو صدیوں لمبی ہے...... اور میں...... آج کے زنداں میں گرفتار...... یادوں کے جھروکوں سے کل کے گرد آلود چہرے کے کرب کو محسوس کرسکتا ہوں۔ کل...... وہ اندھی ماں ہے جس کی کوکھ سے میں نے جنم لیا تھا...... اور یہ اندھی ماں گردشِ لیل و نہار سے بے فکر اپنے بچے کے پیچھے پیچھے ہاتھ پھیلائے تمیں سالوں سے لمبی مسافت طے کرچکی ہے...... ہر آنے والی صبح میں جاگ کر دیکھتا ہوں...... وہ مجھے چند قدم...... کچھ ساعتیں...... اور چند سانسیں دُور کھڑی نظر آتی ہے......

مگر کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں اُٹھا رکھا ہے...... اُس کی خوشبو نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے...... مگر جس وجود کی آنکھ سے میں کل کو دیکھ رہا ہوں وہ کیا ہے......؟

حقیقت آج ہے یا کل...... یہ جسم تو میں خود ہوں...... آج اور کل...... یہ تو صرف میرا احساس ہے...... کل کھو دینے کا احساس اور آج ضرورتوں کا احساس...... قدموں میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ اس راہ پر میں آگے دیکھ کر کیا کروں گا...... مستقبل کی آنکھ تو میں

نے خود ہی چھوڑ لی ہے...... آج...... میرے قدموں میں ضرورتوں اور حاجتوں کے انبار لیے کھڑا ہے...... اپنے پیچھے ایک روشنی سی محسوس کرتا ہوں...... تاریک سرنگ کے اُس پار میں ایک دنیا چھوڑ آیا ہوں...... کیوں نہ انھی قدموں پہ واپس لوٹ جاؤں...... مگر وقت کا بیل تو آنکھوں پہ پٹی باندھے مجھے حالات کے کولھو میں پیس ڈالے گا۔ اُسے تو آگے ہی کو چلتے رہنا ہے۔ میں کیوں نہ وقت کے بہتے دھاروں سے نکل بھاگوں...... ماضی کی یادوں کی گمبھیر چھاؤں تلے کچھ دیر ستاؤں...... خدا کی قسم جوانی بالکل راس نہیں آئی...... کئی بار سوچتا ہوں کہ بچپنے کی اُن راہوں کو نکل جاؤں جو چلڈرن پارک کو جانکلتی ہیں...... وہاں سیمنٹ کی بنی ڈھلوان سے پھسلتا رہوں...... جوانی کی سیڑھیاں چڑھ کر ڈھلوان پر پھسل پڑوں اور بچپنے کی گود میں جا گروں...... اور جب مجھے موت آجائے تو آج...... اپنے کاندھوں پر میرا جنازہ اُٹھائے مجھے کل کی گود میں دفن کر دے...... مستقبل کے جُھریوں بھرے چہرے میں مجھے اپنا بڑھاپا نظر آرہا ہے مجھے مستقبل سے خوف آتا ہے...... میں بہت بزدل ہوں...... تلخ حقیقتوں کا سامنا نہیں کر سکتا تو کل کی گود میں سر چھپا لیتا ہوں...... یادوں کے نیلے پیلے دائرے بنتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں...... مگر آنکھیں تو کھولنی ہی پڑتی ہیں کیوں کہ ہمیں زندہ رہنے کی ضرورت ہے...... اور خوشیاں...... عید تو ہر سال خوشیوں کا ایک کھوکھلا سا احساس دلاتی ہے

...... یادوں اور محرومیوں کا احساس

مگر...... محرومیاں کیسی...... اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے...... پیارے پیارے بچے ...... اچھی سی بیوی...... معقول آمدن...... والدین...... مگر وہ تو میرے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ آج حساب ہی کیوں نہ کرلوں کیا کھویا...... کیا پایا...... یادوں کے افق پر کچھ دھند لکے سے...... کچھ سائے سے......

ایک سایہ...... ننھا سا سایہ...... میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں۔ جب میں بالکل بچہ تھا۔ ماں کے مرجانے کے بعد میں دادی کے پاس رہا کرتا تھا...... مجھے یہ بھی یاد ہے کہ صبح ناشتہ کر کے میں اور مُنی روزے کا آغاز کرتے۔ ہماری دادی اماں بتایا کرتی تھیں کہ بچوں کا

روزہ صبح سورج طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے وقت پورا ہو جاتا ہے...... مگر آخری روزہ ہم نے سحری سے لے کر سورج غروب ہونے تک رکھا۔ منّی کے سوکھے چہرے پہ خوشیوں کا ایک گمبھیر احساس تھا...... اس شام مجھے یوں ہی نیلے آسمان پر سیکڑوں چاند نظر آ رہے تھے...... مگر چاند تو صرف میں نے ایک ہی بار دیکھا تھا۔ مسجد کے مینار سے تھوڑا سا اُس طرف...... پھر نہ جانے وہ کہاں چھپ گیا...... منّی چاند کو نہ دیکھ سکی...... اداس ہو گئی...... میں نے اُس کی اداسی کو محسوس کیا۔ اور وہی احساس آج بھی مجھے اور منّی کو زندگی کی ان طویل راہوں پہ بیل گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ڈوبتی ہوئی زندگی کی شام کی طرف رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔

ہاں! میں تو بات کل کی کر رہا تھا۔

کل کی عید کی خوشیوں کا احساس شام ہی سے روشن تھا...... گھر میں ہنگامہ سا تھا...... رات گئے تک عید کی تیاریاں جاری رہیں...... آپا...... باجی...... خالہ جان...... پھوپھی...... صفیہ...... ذکیہ...... منّی اور میں نے ہاتھوں پہ مہندی لگائی تو شام کی سرخی کا رنگ نکھر گیا۔ رات کو سونے سے پہلے میں نے اور منّی نے کئی بار اپنے اپنے بکس کھولے...... اور بند کیے...... عید کے لیے کپڑوں اور دوسری چیزوں کو سلیقے سے رکھا...... اُن کی ایک ایک شکن اور ایک ایک بٹن کو دیکھا...... اور پھر تایا ابو سے کہانی سنتے سنتے نہ جانے کب سو گئے۔

صبح اُٹھے......

ہر کوئی بھاگم بھاگ اپنی اپنی چیزیں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ صبح سویرے سب بچے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے عید کے لیے تیار ہو گئے...... سنہری شیروانی...... زری جوتے...... اور رنگ برنگے کپڑے پہنے...... گھر کے سب بچے صحن میں بچھے سفید ٹاٹ پر ایک قطار میں بیٹھ گئے...... خوب ہنگامہ ہوا...... ہر کوئی آگے بیٹھنے کی کوشش کرتا...... کچھ دیر بعد دادا جان بھی نماز کے لیے تیار ہو کر آ گئے......

جاپانی کورے لٹھے کی شلوار قمیض...... اور کریم ریشمی شیروانی...... تلّے والے کھسے

......کلف لگا اونچا شملہ...... سنہری زنجیر سے لٹکی جیبی گھڑی......

قطار میں عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی۔ مُنی، ٹلو، بلو، انور، اکرم، اسلم، صفیہ، ذکیہ، صغریٰ باری باری قطار سے اٹھ کر دادا جان کو سلام کرتے...... دادا جان مسکراتے ہوئے صندوقچی سے نکال کر چاندی کا ایک روپیہ تھما دیتے...... مجھے خاص طور پر بہت پیار کرتے...... خاندان کے سب مرد اور لڑکے اکٹھے ہو جاتے...... اور دادا جان کے ساتھ ایک گروہ کی صورت قبرستان جاتے...... عجیب خاموشی سی.... عجب وقار سا...... قبرستان جا کر دادا جان سب قبروں پر فاتحہ پڑھتے...... ہر ایک کے بارے میں بتاتے...... بڑے الجھے الجھے رشتے ....ایک بڑی منظم لڑی میں جڑ جاتے...... تو میں سوچنے لگتا کہ قبرستان میں دفن ہر کوئی ایک دوسرے کا رشتہ دار ہے...... قبرستان میں بھی زیرِ زمین ایک گاؤں بستا ہے...... انسانوں کے رشتے کتنے اٹوٹ ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی نسلوں تک زندہ رہتے ہیں...... کاغذوں میں ان کا اندراج ہوتا ہے۔ شجروں اور زمین کے فرد میں یہ نام صدیوں تک رشتوں کی نوید دیتے ہیں...... قبرستان سے سب لوگ عیدگاہ چلے جاتے۔

دلوں کی رنجشیں، کدورتیں...... رقابتیں ختم ہو جاتیں۔ ہر کوئی عیدگاہ سے دھلا دھلایا واپس آتا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ عیدگاہ سے واپسی کا رستہ لمبا اور نیا اختیار کیا جائے۔ گاؤں کے مولوی عبدالغفور بتایا کرتے تھے کہ گھر کو واپس جانے والے راستے پر فرشتے رحمت کے پھول برساتے ہیں۔

دستر خوان پر خاندان کے سب افراد اکٹھے کھانا کھاتے...... خاندانی جھگڑے...... گھریلو مسائل...... ان سب کا حل ڈھونڈا جاتا...... ازالہ کیا جاتا...... ہم لوگ اس تاڑ میں رہتے کہ چچا اور تایا ابو دستر خوان سے اٹھیں تو ان سے عیدی وصول کریں۔

مُنی عیدی اور عید کی خریداری میں ہمیشہ میری حصہ دار ہوا کرتی تھی...... وہ عیدی کے تمام پیسے میرے بکس میں ڈال دیتی۔ گوکل کا لڑکا کرشن چند میرا دوست تھا...... چاندی کا روپیہ دے کر اس سے تانبے کے چونسٹھ لال پیسے لے لیتے پھر ان کا مصرف ہمارے لیے

مسئلہ بن جاتا...... منی کے لئے گڑیا، بینی مٹھائیاں، گیند، غبارے، تختے، جھولے...... میں شام کو کرشن چند کے ساتھ لدا پھندا گھر واپس آتا مگر پیسے پھر بھی بچ جاتے۔

کل نے کروٹ بدلی...... تاریخ نے ایک نیا ورق الٹ دیا...... اس دفعہ عید کا چاند بہت اداس تھا۔ اس سال دادی فوت ہوگئی تھیں...... گوکل کا بیٹا کرشن چند ہندوستان چلا گیا تھا...... اُن دنوں میں گاؤں کے سکول جایا کرتا تھا...... اس عید پر گاؤں میں کوئی ہنگامہ نہ تھا...... ہندو یہاں سے جاچکے تھے اور کچھ لٹے پٹے مہاجرین ان کے جلے گھروں میں آباد ہو چکے تھے۔ پاکستان کو وجود میں آئے چند روز ہی ہوئے تھے...... ایک اداس اور سہما ہوا احساس گلیوں میں رینگ رہا تھا۔ اس عید پر چاندی کا روپیہ لے کر گیا مگر کرشن چند تو جاچکا تھا۔ گوکل کی جلی دوکان سے تانبے کے کچھ جلے سکے ملے۔ دوکاندار نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ انہیں میں نے اپنے بکس میں ڈال دیا۔

کل اوجھتی رہی...... دادا جان اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے مگر ان کا رکھ رکھاؤ ابھی تک جوان تھا...... عیدی کے پیسوں والا لکڑی کا صندوقچہ وہی تھا۔ البتہ ہماری قطار میں ایک سلجھاؤ سا آ گیا تھا۔ سب بچے اب خاموشی سے قطار میں بیٹھ جاتے۔ آگے بیٹھنے کے لیے اب کوئی جھگڑا یا ضد نہ کرتا۔ چاندی کے روپے اب ختم ہو گئے تھے...... کاغذ کے روپے والے دو نوٹ ملتے جو دوپہر سے پہلے پہلے ہی خرچ ہو جاتے...... فاطمہ بی بی ہی تو کہا کرتی تھیں:

''موئے کاغذوں کے روپے میں برکت ہی نہیں رہی۔''

گوکل کی جلی دکان کی جگہ ایک بہت بڑا جنرل سٹور تیار ہو گیا تھا جہاں ضرورت کی ہر شے دستیاب تھی...... منی اب عیدی کے پیسے اپنے ہی پاس رکھا کرتی تھی۔ وہ اب اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ میں اس کے لئے کوئی گڑیا بھی خرید کر نہ لا سکتا تھا...... اب تو وہ شیشم کا درخت ہی نہیں رہا جس پر موٹے بان کے رسے سے پینگیں ڈالا کرتے تھے...... اب تو صرف اس کے قدموں کے نشان باقی ہیں...... جہاں سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں...... جانے یہ کونپلیں کب تناور درخت بنیں گی...... اُن پر پینگیں ڈالی جائیں گی...... اور پھر میری بچی...... یہ بھی

ممکن ہے کہ میں اُس وقت تک اس شیشم کی طرح کٹ جاؤں...... جب میری کونپلیں نہیں پھوٹیں گی تو کل کی ایک اور آنکھ رو پڑے گی۔

کئی عیدیں گزر گئیں...... سالوں کی سیڑھی لگا کر میں سکول کی چھت سے اوپر کالج چلا گیا...... یہ غالباً حویلی کی آخری عید تھی...... دادا جان نے مونچھوں کو خضاب لگایا...... ململ کے مایاں لگے شملے والا کلاہ پہنا...... سفید شیروانی زیب تن کی...... جیبی گھڑی کی زنجیر شیروانی کے بٹن میں اٹکائی...... لکڑی کا صندوقچہ میز پہ رکھ دیا گیا۔ دادا جان کرسی پر آن بیٹھے...... مجھ اکیلے کو ناٹ پہ کھڑا پایا...... مُنّی اب میرے ساتھ قطار میں کھڑی نہیں ہو سکتی تھی...... اکرم اور اسلم اپنے ماموں کے یہاں عید منا رہے تھے۔ صفیہ اور ذکیہ کی شادی ہو چکی تھی...... وہ اپنے سسرال عید منا رہی تھیں...... دادا جان نے صندوقچہ کھولا...... اور کانپتے ہاتھوں سے مجھے پانچ روپے کا نوٹ تھما دیا...... اُن کے چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہو گئیں...... میں نے اُن کی بوڑھی اداس آنکھوں میں پہلی دفعہ آنسو دیکھے...... میں تڑپ اٹھا...... میں نے سارا گھر اکٹھا کر لیا...... دادا جان ہلکے ہلکے مسکرانے لگے۔ کسی کو پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی...... پھر دادا جان نے تائی اور تایا جان کو بلا لیا...... ان سے کافی دیر اکیلے میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ مُنّی کو بلا لیا گیا...... انھوں نے مُنّی کے سر پر ہاتھ پھیرا...... صندوقچی سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور مُنّی کو عیدی دے دی۔ پھر دادا جان نے شیروانی کی بغلی جیب سے دو مخملی ڈبیاں نکالیں۔ سونے کی انگوٹھیوں کے نگینے مسکرانے لگے۔ میں نے مُنّی کو...... اور مُنّی نے مجھے انگوٹھی پہنا دی...... دادا جان دھیرے دھیرے مسکراتے رہے...... دعائیں دیتے رہے...... سب رو رہے تھے...... مُنّی کی ہچکی بندھ گئی...... اسی شام خاموشی سے ہماری شادی ہو گئی...... مُنّی نے بچپن کی سنبھالی گڑیا مجھے دے دی اور میں نے گوبتی کی جلی دکان سے اٹھائے تانبے کے روڈے بادشاہ والے سکے مُنّی کو دے دیے۔

کل نے قبر کھودی...... دادا جان نے رختِ سفر باندھا...... کل کی اُداس آنکھ بھر آئی...... اُس نے اپنے ایک بچے کو بازوؤں سے اُتار کر دھرتی کی گود میں سلا دیا...... اتنا بڑا

الیہ...... اتنا بڑا حادثہ...... ہمارے خاندان کی تنظیم ٹوٹ گئی...... دستِ شفقت اٹھ گیا۔ سائبان سروں سے اٹھالیا گیا...... گاؤں کی سب سے بڑی حویلی ویران ہوگئی...... رشتوں کی مضبوط ڈور ٹوٹی تو سب تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے...... حویلی چھوٹے چچا کو دے دی گئی...... وہ کمروں کو بند کر کے کراچی چلے گئے۔ اس حویلی کے کونے میں چھوٹی سی کوٹھڑی میں فاطمہ بی اکیلے رہ گئی تھیں...... وہ کبھی کبھی مہینے میں ایک آدھ بار کمروں کی جھاڑ پھونک کر دیتیں...... داداجان کا کلاہ شیروانی...... بندوق اور پاکٹ واچ بکس میں بند کر دیے گئے تھے...... ان کے تمام کپڑے نائی کو دے دیے گئے...... ان کی کرسی...... شیشے والا میز، پلنگ اور دو تپائیاں سٹور میں ڈال دیے گئے۔

اب کے عید جو آئی تو بہت اداس اور بہت سوگواری...... منی میٹرنٹی ہوم میں داخل تھی...... میں بس ایک ہی روز کے لیے گاؤں جا سکا...... گلیاں سنسان اور گھر کھنڈر لگ رہا تھا، ایک تازہ سوندھی سوندھی خوشبو والی مٹی کی قبر پر میں نے فاتحہ پڑھی...... دعا والے ہاتھ میں نے آنکھوں پر رکھ لیے اور بلک بلک کر رو پڑا...... اپنے باپ سے بچھڑ کر ایک کم سن بچے کی طرح ان قبروں میں بھٹک رہا تھا...... وہ اسلاف کی باتیں...... وہ شجرہ نسب...... وہ الجھے اُلجھے رشتے...... وہ قبر کی مٹی کے رشتے...... مگر آج میں اکیلا تھا۔

کوئی ہے......؟ جو میری اُنگلی پکڑ کر مجھے قبیلے کی ایک ایک قبر پر لے جا کر بتائے...... وہ اُلٹے سیدھے رشتے...... آج...... اور اُلجھے جا رہے تھے۔ عید گاہ سے واپسی کے طویل رستے پر آج میں بالکل تنہا تھا۔

''طویل نئے راستوں سے واپس لوٹوں گا تو رحمت کے فرشتے مجھ پر پھول برسائیں گے۔''

وہ رحمت کا فرشتہ...... آج طویل تر واپسی کے راستوں پر کیوں مجھے تنہا چھوڑ گیا ہے؟ میں آج ایک اور اُلجھن میں پڑ گیا...... کہاں جاؤں گا...... کس کے گھر ٹھہروں گا...... چھوٹے چچا کے ہاں یا اکرم، اسلم کے گھر...... وہ سلسلہ تو ٹوٹ ہی گیا تھا جب عید پر ایک ہی

دسترخوان پر سب اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ پرانی ٹاٹ پر قطار بنائے دادا جان سے عیدی وصول کیا کرتے تھے۔

اسلم کے یہاں گیا...... تو سب چپ چپ الجھے ہوئے تھے۔ عامر مجھ سے عیدی کا تقاضا کرنے لگا۔ جب میں نے اسے عیدی دی تو پریشان ہو گیا

"Ten rupees only ! "

''مگر بیٹا! میں تو خود عیدی وصول کرنے آیا ہوں......''

سوچا...... بڑی حویلی ہو آؤں...... گزری کل بے چاری نہ جانے کس حال میں ہو گی...... حویلی کی کسی ٹوٹی کھاٹ پر لیٹی اونگھ رہی ہو گی...... وہاں جاتے ہوئے ہول آ رہا تھا حویلی کا بڑا پھاٹک کھولا تو دل دہل گیا...... اتنی بڑی حویلی سنسان پڑی تھی...... دن کے اجالے میں بھی اندھیرا سا محسوس ہونے لگا...... میرے قدموں کی آواز سن کر فاطمہ بی سامنے کوٹھڑی سے نکلیں...... مجھے گلے لگا لیا...... انہیں دیکھ کر چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہا...... مجھے پا کر وہ رو پڑیں یا ہنس دیں...... یہ میں اندازہ نہ کر سکا۔ فاطمہ بی نے اندر سے وہی پرانا، جانا پہچانا ٹاٹ دھوپ میں بچھا دیا اور میں اس پر بیٹھ گیا۔ فاطمہ بی کچھ بولتیں، کچھ کہنا چاہتیں مگر رو پڑتیں۔ پھر وہ چپ سی ہو کر رہ گئیں...... میں اٹھنے لگا تو میرے لیے سویاں لے آئیں۔

''بڑی بی! آپ میرے ہاں کیوں نہیں آ جاتیں...... اکیلے میں آپ کا جی نہیں گھبراتا؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر بیٹا میں سوچتی ہوں چند روز ہی تو اور جینا ہے۔ کون نت نئی قبریں بنا تا رہے گا۔''

''اچھا اب چلتا ہوں...... پھر کبھی آؤں گا اور منّی کو بھی ساتھ لاؤں گا۔''

''بیٹا! ذرا بیٹھو...... میں جانتی ہوں کہ تم کیوں آئے ہو۔''

فاطمہ بی ہانپتے ہانپتے گئیں اور مٹی کا ایک برتن اٹھا لائیں...... برتن کو ٹاٹ پہ انڈیل دیا...... تانبے کے لال...... پیتل کے پیلے اور نکل کے سفید سکے ٹاٹ پہ بکھر گئے اور

انہیں بوڑھے کانپتے ہاتھوں سے گننے لگی۔

''بیٹا! تم بھی گننا...... مجھے گنتی نہیں آتی......''

میں کیا گنتا...... میں تو ان دکھوں کو گن رہا تھا جو میرے حصے میں آئے تھے......

فاطمہ بی نے پیسوں کی دو ڈھیریاں بنا دیں۔

''بیٹا یہ تمہاری عیدی ہے...... اور یہ مُنی کی۔

میں نے وہ پیسے کیا سمیٹے گویا یادوں کے انگارے دل کی جیبوں میں ڈال لیے ہوں بھاری قدموں سے...... بوجھل دل لیے اُٹھا کہ دہلیز نے پاؤں پکڑ لیے...... ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کے پاس کوڑے کے ڈھیر پر لکڑی کا سفید سا جانا پہچانا صندوقچہ پڑا تھا...... اسے اٹھالیا...... انگارے اس میں ڈال دیے...... دھواں سا اُٹھا کہ دل بیٹھ گیا۔ مگر میں خوش تھا کہ اس صندوقچی سے چونسٹھ لال پیسے گن کر جب مُنی کو عیدی دوں گا تو وہ کتنی خوش ہو گی...... شام کو واپس لوٹا...... صندوقچہ اٹھائے ہسپتال مُنی کے پاس چلا گیا...... وہ صندوقچہ دیکھ کر تڑپ اٹھی...... میں نے ایک ایک پیسہ گن گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور یہ بھول ہی گیا کہ مُنی ہسپتال کیوں آئی تھی۔

کل نے مجھ سے آنکھ ملائی...... دونوں کی آنکھیں بھر آئیں...... کل پھر مسکرا دی...... مُنی کی کوکھ سے میرے پیار کی کونپلیں پھوٹ پڑی تھیں......

مُنی نے موری والا پیسہ دھاگے سے باندھا اور بے بی کے گلے میں ڈال دیا۔

□□□

آدم زاد

سلمٰی کی ماں حویلی کے سرے پر کھپریل کی چھت والی کوٹھڑی میں چپکے سے
مرگئی...... بے ہنگام اور گم نام سی موت...... مگر وہ زندہ ہی کب تھی...... چھدرے چھدرے
دکھوں کی چادر میں لپٹی، چلتی پھرتی لاش...... یوں ہی بس مری مری سی زندگی...... فاطمہ تو
اُس روز ہی مرگئی تھی جس روز نواب صاحب اس جہاں سے اٹھ گئے تھے...... حویلی اُداس
اور آنگن سوگوار ہو کر رہ گیا تھا...... فاطمہ نے پہلی دفعہ سوچا کہ وہ کون تھی...... اس حویلی میں
کب اور کیوں آئی تھی...... اپنی تاریک کوٹھڑی کی تیل سے چُپڑی سیاہ دہلیز پہ پہروں وہ بیٹھ
کر سوچا کرتی...... بے مقصد سی سوچیں...... خالی خولی یادیں...... کبھی کبھی وہ یہ بھی حساب
کرلیا کرتی کہ کیا کچھ کھویا...... اور کتنے دکھ پائے...... یادوں کے افق پہ کچھ دھند لکے سے
...... کچھ سائے سے...... مستقبل کی راہیں تاریک...... چار سو اندھیرے ہی اندھیرے......
فاطمہ کو جب کچھ نظر نہ آتا...... تو اُس کی آنکھوں کے دریچوں میں آنسوؤں کے چراغ روشن
ہوتے...... اور اُس کی اداس پلکوں سے الجھ کر خشک ہو جاتے...... صحرا کی طرح اُس کی ویران
زندگی...... جیسے اُس نے کبھی بہار دیکھی ہی نہ ہو۔

وہ اُس حویلی میں کیوں، کب اور کیسے آئی تھی...... وہ کون تھی...... اسے کچھ یاد
نہیں تھا...... چھوٹی سی گوری چٹی لڑکی...... بھوری بھوری آنکھیں...... الجھے الجھے سنہری بال
...... وہ ننگے سر...... ننگے پیر...... چیتھڑوں میں ملبوس...... حویلی کے اندر بھاگتی دندناتی پھرتی

......وہ کب جاگتی تھی...... وہ کب سوتی تھی...... جب سب جاگ جاتے...... وہ جاگی ہوئی ملتی...... اور جب سب سو جاتے......تو وہ اپنے سوئے مقدر کے ساتھ جاگ رہی ہوتی۔

باورچی خانے......زنانے...... مردانے...... نواب صاحب کے پاؤں دابنے، برتن مانجنے...... جھاڑ پونچھ کرنے...... کپڑے دھونے...... بازار سے سودا سلف لانے......

حتیٰ کہ وہ ہر جگہ استعمال ہوئی...... اتنی...... کہ وہ جوان ہو گئی، جوانی کا پھوڑا پھوٹتا چلا گیا...... وہ خود کو ویسی دیسی آنچ میں سلگتا ہوا محسوس کرنے لگی...... پانی بھرنے جاتی تو رہٹ کی آڑ میں بطخوں کی طرح چھپک چھپک...... اپنی ٹانگوں اور بانہوں پہ پانی ڈالتی...... چلّو سے دہکتے رخساروں کو سینچتی تو ایک بھاپ سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی...... ایسے میں اُس کا جی گھبرا اُٹھتا ......اور پھر ایک روز اس کی آنکھوں میں جوانی کی چور بتیاں جل اٹھیں...... نواب صاحب کے پاؤں دابنے گئی...... رات گئے لوٹی...... تو آنکھوں کی چنگاریاں بجھی بجھی سی تھیں...... نواب صاحب بجھتی چنگاریوں کو ہوا دیتے رہے...... طوفان گزر گیا...... تو دھول اور راکھ رہ گئی۔

حویلی کے درخت سے ٹوٹ کر آم گلی میں گر گیا......آوارہ لونڈے جھپٹ پڑے ......ہر ایک نے تھوڑا سا جو لگایا تو چھال میں مڑی خالی گٹھلی رہ گئی...... وہ گٹھلی فاطمہ کے حصے میں آئی...... اس کا جی متلانے لگا...... سر کو چکر آنے لگے......حتیٰ کہ وہ باورچی خانے کے لیے رکھی ساری املی چٹ کر گئی۔

اور پھر جس روز فاطمہ نے پیلی آم کی گٹھلی جیسی لیس سے لتھڑی بچی کو جنم دیا...... تو حویلی میں بھونچال آ گیا...... بے بی سیما سے لے کر بڑی بیگم تک نے کان یوں پکڑ لیے جیسے خاندانی وقار کا تھیم شحیم بدن آم کے چھلکے سے پھسل کر بازار کی گندی نالی میں گر گیا ہو...... یہ خبر سن کر نواب صاحب کو جیسے سانپ سونگھ گیا...... اونچی حویلی...... خاندانی وقار...... آیا کے یہاں ناجائز بچی...... نواب صاحب سوچوں کے مٹکے میں جھانکتے تو اخلاق کے گندے سڑے سیاہ پانی میں انہیں اپنی ہی صورت نظر آتی...... وہ گھبرا اُٹھتے...... اپنے وجود کو ٹٹولتے تو اتنی بھاری قبا میں بھی وہ اپنے آپ کو ننگا محسوس کرتے۔

"یہ بچی...... میری نہیں ہو سکتی...... جانے کس کس نے بھیک ڈالی ہوگی۔" ساری حویلی نواب صاحب کے فیصلے کی منتظر تھی...... مگر وہ فیصلہ کس کے خلاف کرتے...... آخر کار فاطمہ حویلی کے آخری کونے والی کوٹھڑی میں اٹھ گئی...... اس کا زنانے...... مردانے...... میں داخلہ ممنوع قرار پایا۔ اور پھر وہ ایک طویل عرصے کے لیے اس کوٹھڑی میں دفن ہو گئی۔ پیلی سی رنگت...... مغموم سی مسکراہٹوں میں الجھی...... وہ بچی سے اپنا جی بہلاتی رہتی...... جو کوئی اسے دیکھتا...... دھک سے رہ جاتا...... سیاہ اور تاریک کوٹھڑی...... دیوار سے جھانکتا ہوا بھیا تک سا روشن دان، جانے وہ باہر کو کھلتا بھی تھا یا نہیں۔ کھڑکی...... جس میں پکی اینٹیں چن دی گئی تھیں اور کوٹھڑی کی تیل سے چپڑی سیاہ دہلیز......

فاطمہ جوانی کی دہلیز پر ہی بوڑھی ہو گئی تھی...... جوانی جیسے کوئی پھانس تھی...... بچی پیدا ہوئی تو نکل گئی۔

صفیہ بی بی اور شبو فاطمہ کا بہت خیال رکھتے...... کبھی کبھی سب سے چھپ چھپا کر فاطمہ کے لیے پھل، انڈے اور مٹھائی لے آتے...... اور صفیہ اُسے پاس بٹھا کر مزے لے لے کر پوچھا کرتی۔

"سن ری فاطو! تیری کوئی بات نہیں چلی...... شہنائیاں نہیں بجیں...... ہاتھوں پہ مہندی نہیں لگی...... ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ رسیلے گیت نہیں ابھرے...... تو پھر سچ سچ بتا ...... یہ مٹی کس نے گوندھی...... یہ خمیر کیسے اٹھا...... اور یہ چاندی بچی...... اس کا باپ کون ہے ...... تو اس کے ہاتھ کیسے پیلے کرے گی۔"

"بی بی جی! میں تو ایک پاپن تھی...... غلاظتیں سمیٹتی رہی...... تو یہ نصیبوں جلی پیدا ہوئی...... گندگی کے ڈھیر پہ اُگی بوٹیوں سے توڑ کر پھلیاں کون کھائے گا۔"

گُڈی کی اُترن، سرخ چڈی اور پیلے غرارے میں ملبوس گھٹنوں چلتے چلتے ننھی معصوم سی بچی وقت کے فاصلے طے کر کے کوٹھڑی کی دہلیز سے باہر آ جاتی...... اور صفیہ بی بی کو دیکھ کر مسکراتی...... تو اُس کا کلیجہ منہ کو آ جاتا...... وہ ادھر اُدھر دیکھتی...... کوئی نظر نہ آتا...... تو

دوز کر جاتی..... اور ننھی سلمٰی کو چوم چوم جاتی..... وہ بھی تو ایک کوکھ جلی ماں تھی..... اونچی حویلی کی روایات کی ڈولی میں بٹھا کر اسے لینے جب کوئی شہزادہ نہ آیا..... انتظار کر کر کے جب وہ تھک کر ٹوٹ گئی..... اسے بہت بھوک لگی..... تو ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے تقدس کے حصار کو چاٹنے لگی..... تصورات کی خالی ہنڈیا تقدیر کی آنچ پہ کب تک پکائی رہتی..... آخر اُبال آ گیا..... اور شیئو کو گھر سے نکال دیا گیا۔

اصولوں اور ضابطوں کے بندھن ٹوٹنے تو فاطمہ کا حویلی میں آنا جانا پھر شروع ہو گیا..... اُس روز کے بعد نواب صاحب چوکی سے نیچے کبھی نہ اُترے..... لمبی سی تسبیح کے سیاہ، بے ڈول دانوں کی گنتی کہیں رات گئے ختم ہوتی تو نوافل کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا..... قالین کی نرم گداز جائے نماز..... کبھی کبھی نواب صاحب چوکی پہ ڈھا سا لگا کر سو جاتے..... بلی خُرخُر کرتی ان کی گود میں سمٹ آتی..... تو باقی رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

حویلی کی اونچی بوسیدہ دیواروں کے پیچھے..... دو بچوں کے علاوہ کئی ایسی منتشر سی کہانیاں جنم لیتی رہیں..... مگر سب کچھ پتھر کی ان دیواروں کے اندر ہی رہا..... ہلکی ہلکی سرگوشیاں..... کھسر پھسر..... کبھی کبھی سسکیاں اور آنسو..... یہ سلسلے طویل ہو جاتے تو بات نواب صاحب تک آ جاتی..... وہ مایوس سے..... یوں ایک بے سمت سا فیصلہ صادر کر دیتے..... اور پھر ان کے نوافل کا سلسلہ کچھ اور طویل ہو جاتا۔ چھوٹے نواب بلند دیواروں سے باہر وہ سب کچھ کر رہے تھے جو ایک نوجوان نواب جائز سمجھتا ہے۔

حویلی کے آنگن میں پھوٹی بیل پر پیلے پیلے پھول کھلنے لگے..... پھر یہ بیل پورے در و دیوار پہ چھا گئی..... اس کا گداز سا احساس سارے صحن میں چمک اٹھا۔ چھوٹے نواب صاحب بیل کی کنواری خوشبو سے ایک عجیب سی تسکین محسوس کرتے مگر بڑے نواب صاحب کے کمرے میں سلمٰی کے پاس جانے کی اُسے کبھی جرأت نہ ہوتی۔

فاطمہ کے بالوں میں چاندی کے تار نمایاں ہونے لگے تھے..... بڑے نواب صاحب کی بینائی جاتی رہی..... سلمٰی ہر وقت نواب صاحب کی خدمت میں مصروف رہتی

جب کہ فاطمہ نے باورچی خانہ سنبھال رکھا تھا۔ وہ جب کبھی سلمٰی کو آواز دیتی ...... وہ ہرنی کی طرح بھاگتی ہوئی حاضر ہو جاتی۔ فاطمہ اسے دیکھ کر ٹھٹک سے رہ جاتی ...... وہ اس کے میلے کچیلے ننگے پاؤں سے شروع ہو کر اس کی خوب صورت آنکھوں کے روشن دریچوں تک سب کچھ ڈھونڈ ڈالتی ...... پھر وہ ہانپ جاتی۔

''نگوڑی دھریک کی طرح بڑھ رہی ہے۔''

وہ یہ بھول ہی جاتی کہ اس نے سلمٰی کو کیوں بلایا تھا ...... فاطمہ گزرے لمحوں کو بھول گئی ...... مگر مستقبل کے عفریت سے اسے خوف آنے لگا تھا۔

موسم بدلا تو نواب صاحب کا دمہ بُری طرح اُکھڑ گیا ...... چھوٹے نواب صاحب شہر سے ڈاکٹر بلوا لائے ...... بڑے زور و شور سے علاج شروع ہو گیا ...... علاج معالجے کا انداز بڑا روایتی تھا۔ ڈاکٹر صبح شام نوکر کے ساتھ شہر سے آتا ...... اور قصبے کے بڑے بازار کے بیچوں بیچ جب تانگہ گزرتا ...... تو سب دکان دار بڑی تشویش سے نواب صاحب کا ذکر کرنے لگتے۔

''اللہ خیر کرے ...... بڑے نواب صاحب کی طبیعت شاید زیادہ ہی خراب ہے۔''

''سنا ہے کہ نواب صاحب نے تو وکیل کو بُلا کر وصیت بھی لکھوا دی ہے۔''

''حویلی بڑے نواب صاحب ہی کے دم سے آباد ہے ...... بڑا اچانک تُمل گیا تو ......''

''آخر آدمی کے وقت کا کوئی دوسرا سرا بھی تو ہوتا ہے ......''

اور نواب صاحب کے وقت کے آخری سرے سے الجھی سلمٰی بری طرح نڈھال ہو رہی تھی۔ زندگی کی ڈوری آہستہ آہستہ گرفت سے نکلی جا رہی تھی ...... جب کہ حویلی کے اندر کے معمول بدستور تھے ...... کسی کو بھی نواب صاحب کی فکر نہ تھی ...... ہر کوئی اپنے حصے کی کتاب کھول کر بیٹھا ہوا تھا ...... تھکے ماندے ملاح کی طرح نواب صاحب زندگی کے اس دریا کو جلد عبور کر لینا چاہتے تھے ...... وہ یہ ورد مکمل کر کے ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہتے تھے ...... اور سلمٰی اُن کے ایک ایک لمحے سے لپٹ لپٹ جا رہی تھی۔

''سلمٰی بیٹی ......!''

سلمٰی جو منتظر ہوتی ...... نواب صاحب خاموش ہو جاتے۔ یہ خاموشی اُس کے لیے ایک نوحہ بن جاتی ...... اندیشوں کا ایک طوفان اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

"جب نواب صاحب کی یہ بے نور آنکھیں بھی بند ہو جائیں گی ...... تمام دریچے بند ہو جائیں گے تو ......" سلمٰی گھبرا کر کمرے کے دروازے، کھڑکیاں کھول دیتی۔ گزرتے ہوئے جاڑے کی بچی کھچی سردی کمرے کا رخ کرتی ...... تو سلمٰی نواب صاحب پر کمبل ڈال کر باہر برآمدے کے ستون کا سہارا لے کر پہروں کچھ سوچا کرتی۔

اُس روز نواب صاحب کی طبیعت کچھ بہتر تھی ...... سلمٰی نے ذرا فرصت سے دیکھا کہ صحن کے دھریک کے چتکبرے پھولوں کی خوشبو تمام حویلی میں پھیلی ہوئی تھی ...... چیت کی اس بھیگی ہوئی شام سے پھوٹنے والی خنکی کتنی گداز تھی ...... سلمٰی آسمان سے اترنے والی روشنیوں کو کالے بادلوں میں چھپتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ بادل گرجے ...... برس پڑے ...... اور ٹوٹ کر برسے ...... فاطمہ نے سلمٰی کو باورچی خانے سے آواز دی۔

"بھاگ کر جانا ...... کوٹھڑی کے صحن میں تارے کپڑے اُتار لانا ...... سب بھیگ گئے ہوں گے۔"

سلمٰی بارش میں بھاگی اور ڈیوڑھی کے اس پار پہنچتے پہنچتے تربتر ہو گئی ...... اس سے آگے بڑا اندھیرا تھا ...... حویلی کا تمام صحن بارش سے جل تھل ہو گیا تھا ...... اتنے بادل آج تک نہ برسے تھے ...... صحن کا پانی ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کی پانی کی نالی سے بھی اوپر دہلیز کو پار کر گیا تھا ...... تیز ہوا کے تھپیڑوں اور بارش کے طوفان نے دھریک کی کچی جوانی کی نرم شاخوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کے پھول پورے صحن میں بکھر گئے تھے ...... اس کی خوشبوئیں کیچڑ سے لت پت ہو گئی تھیں۔

بارش تھمی۔

سلمٰی! تم کہاں ہو ...... کدھر مر گئی ہو ......"

فاطمہ نے سلمٰی کو نواب صاحب کے کمرے میں دیکھا ...... پھر پانی سے گزرتی باہر

والی ڈیوڑھی کے پاس کوٹھڑی میں جو گئی ...... تو صحن میں بکھری دھریک کی شاخوں کی طرح اسے ٹوٹی پھوٹی سلمٰی ملی ...... نُچے ہوئے پھولوں کی طرح، وہ کوٹھڑی کی دہلیز کے پاس بکھری پڑی تھی ...... فاطمہ اسے سمیٹنے گئی تو خود بکھر گئی ...... سامنے برآمدے میں کھڑے چھوٹے نواب ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کی دہلیز کے اوپر سے گزرتے، بارش کے پانی کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

آخر شام بادلوں کے خون آلود چیتھڑوں سے سورج آخری بار جھانکنے لگا تو اس کی سرخیاں پورے آسمان پہ پھیل گئیں ...... مشرق سے پھوٹنے والا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا۔

''مگر سلمٰی تو میری بیٹی تھی ......''

یہ بڑے نواب صاحب کی پہلی اور آخری کمٹ منٹ تھی۔

مگر یہ حادثہ نواب صاحب کی موت سے بڑا نہ تھا۔

بڑے روایتی انداز میں نواب صاحب کی تدفین ہوئی ...... نیچے دبے ہوئے حادثے پھر کب اٹھ سکتے ہیں ...... چالیسویں کے بعد حویلی کا بڑا پھاٹک ایک بار پھر بند کر دیا گیا۔

چھوٹے نواب صاحب باہر مردانے میں ڈاکٹر صاحب سے مصروف گفتگو تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! میں کہہ رہا تھا کمٹ منٹ بہت ضروری ہوتی ہے اس کے بغیر رشتوں کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی بیوی ہو سکتی ہے نہ کوئی بیٹی نہ بہن۔''

''نواب صاحب! انسان تو ازل سے خون کے رشتوں کو پامال کرتا چلا آ رہا ہے ......''

''ڈاکٹر صاحب! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کتنے مضبوط حصار ہوتے ہیں۔ پھاٹک کا صرف چھوٹا سا گیٹ کھلتا ہے۔ پہچاننے والی آنکھ صرف اندر کے آدمی کو اندر جانے کی اجازت دیتی ہے۔''

''نواب صاحب! میں مانتا ہوں دیواریں بہت اونچی اور پھاٹک بہت مضبوط ہوتے ہیں مگر دیواروں کے اندر رہنے والے کتے پلے باہر رکھے برتنوں کو جوٹھا کر دیتے ہیں۔ اور جب کوکھ کسی غیر کے نطفے سے ناپاک ہو جائے تو شیطان ہی جنم لیتا ہے۔''

سٹرائیکر

دسمبر کی سرد طویل رات دھیرے دھیرے بسر ہوتی رہی...... Beach Luxury کی دیواروں پہ سجی نیلی، پیلی اور سرخ روشنیاں...... ہال میں مہکی مہکی خوشبوئیں...... بجھے بجھے لوگ...... سازکی لے پہ قدم بہکتے چلے گئے...... جسم تھرکتے رہے...... بانہوں میں ڈھلتے رہے...... کرسمس کی سرد رات رنگین ہوتی چلی گئی۔

میں ہال سے باہر آگیا......

چاندنی سے ڈھلی ڈھلی سفید دیواریں...... میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا...... سیڑھیوں سے متصل سمندر کا پانی چاندنی کی سفید چادر اوڑھے ایک کمسن بچے کی نیند سویا ہوا تھا...... پانی میں دور تک پھیلی ہوئی سمندری گھاس...... کہیں کہیں پانی سے جھانکتا ہوا چندا کا عکس...... رات سرد ہوتی چلی گئی...... ڈاک یارڈ میں کھڑے ایک جہاز نے طویل وسل دیا...... سویا سویا ماحول چونک اٹھا اور پھر خاموشی کی نیند سو گیا...... کافی دیر تک جہاز کا دھواں چاندنی کو میلا کرتا رہا...... روشنیوں کے ان گنت جگنو شہر کی نیم تاریک جبیں پر مسکراتے رہے اور میں نہ جانے کب تک سیڑھیوں پہ بیٹھا سوچتا رہا۔ "آج میں اتنا اداس کیوں ہوں......؟"

اُلجھے خیالات اور تصورات میں نہ جانے کیوں بھٹکتا رہتا ہوں...... سوچوں نے زندگی میں تلخیاں گھول دی ہیں...... کیا یہ طویل زندگی ایک الجھا ہوا تصور ہے؟ یہ زندگی سمندر کے ساحل پر پانی میں دور تک اُگی گھاس، نیلا خاموش کھڑا پانی، بجتی یادیں، پانی میں

کہیں کہیں سے جھانکتا چندا کا عکس...... نہیں ایسا تو نہیں ...... زندگی ایک ساز ہے جس کی لے پہ قدم ناچتے رہتے ہیں ...... یہ ساز ایک روز ٹوٹ جائے گا...... سمندر کی اٹھتی ہوئی موجیں دور کہیں جزیروں میں دفن ہو جائیں گی۔

سوچنے کے لیے اور کچھ تھا بھی تو نہیں۔ جب کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو وہ یادیں کتنی اذیت ناک ہوتی ہیں جو کرسمس جیسی رنگین راتوں میں دبے پاؤں چلی آتی ہیں...... خوشیوں میں یادوں کا احساس کتنا تلخ ہوتا ہے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا...... درختوں کے سوکھے پتے سیڑھیوں پہ بکھر گئے...... پیچھے کے سوئے ہوئے پتے جاگ اٹھے...... رونے لگے۔ سائیں سائیں کی آواز سے یوں لگتا تھا جیسے کسی یتیم بچے کی لاش پر اُس کی بوڑھی بیوہ ماں سسکیاں بھر رہی ہو......

رات بھیگ گئی...... میں نے اوورکوٹ کے کالر اُوپر چڑھا لیے اور سیڑھیوں سے اتر کر پانی کی سطح تک جا پہنچا۔

"ہاں...... ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ یہ زندگی کیا ہے...... کہیں یہ اُن سیڑھیوں کی طرح تو نہیں جو وقت کے بے کراں سمندر میں دُور تک نیچے چلی جاتی ہیں...... اور ہوا کا کوئی جھونکا یادوں کے پیلے پتے ان سیڑھیوں پہ بکھیر دیتا ہے۔

آج جینی کا بھیجا ہوا کرسمس کارڈ بھی تو ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور بیسیوں یادیں بکھیر گیا...... جانے وہ لوگ ملتے کیوں ہیں جو قریب آ کر بچھڑ جاتے ہیں...... کبھی کبھی دل لاشعوری طور پر محبت کے کچھ رشتے گانٹھ لیتا ہے...... جذبوں کے پاکیزہ اور اٹوٹ رشتے...... لوگ بچھڑ بھی جاتے ہیں مگر اُن کی یادیں مکڑی کے جالوں کی طرح برسوں اُلجھی رہتی ہیں...... جان اور جینی کو بھولنے کی کوشش کرتا ہوں مگر جینی کا خط یادوں کے تانے بانے اور اُلجھا دیتا ہے...... رشتے ٹوٹنے کی بجائے گرہیں اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔

جان اور میں ایک ہی پاور ہاؤس میں کام کرتے تھے۔ وہ وہاں الیکٹریشن تھا...... اور میں ایک اپرنٹس انجینئر...... ۱۹۵۵ء کی کرسمس کی سرد طوفانی رات کو پاور ہاؤس کا ایک

Substation ٹرپ کر گیا۔ آدھی رات کو ہمیں بلا لیا گیا۔ ہم دیر تک ٹرانسفارمر پینل اور لائنیں چیک کرتے رہے۔ اوورلوڈ کی وجہ سے ٹرپ ہوا تھا۔ Channal بدل دیا...... Fault ٹریس ہو گیا۔ باقی رات کے لیے ہماری ڈیوٹی لگا دی گئی...... میں ایک ناول لے کر دفتر میں ہیٹر کے پاس بیٹھ گیا۔ Fault دوبارہ آ گیا...... جان کہیں غائب تھا...... اب کے پاور ایک پول سے شاٹ ہو رہی تھی...... اسے ٹھیک کیا پھر جان کو تلاش کرنے لگا۔ وہ Change room میں کمبل اوڑھے میٹھی نیند سویا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے پڑے Black Board پر چاک سے لکھا تھا:

Here lies Mr. John

From Chrismax 1955

May his soul be in peace.

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

آج تو کرسمس تھا۔ جان کو ایمرجنسی کے لیے نہیں بلوانا چاہیے تھا...... وہ اپنی اس معصوم شرارت پر نادم بھی تھا...... دوسرے روز اُس نے اس حرکت پر معافی مانگ لی...... اُس کی لمبی لمبی پلکوں سے جھانکتی اداس آنکھوں میں التجا بھری اداسی تھی...... وہ ایک شاگرد کی طرح میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

جان ایک محنتی اور شریف طبع انسان تھا...... وہ عموماً شفٹ میں میرے ساتھ ہی کام کرتا...... اکثر مسکراتا رہتا...... مگر کبھی کبھی اداسی کی شبنم اس کی نیلی آنکھوں میں سمٹ آتی...... اور وہ سب سے الگ تھلگ شفٹ روم کے بینچ پر بیٹھا پہروں کچھ سوچا کرتا۔

"جان! آج تم اتنے اداس کیوں ہو......؟"

"کچھ نہیں صاب...... کبھی کبھی یوں ہی پریشان ہو جاتا ہوں...... یہ سوچ کر کہ میں اور جینی اس بھری دنیا میں تنہا کیوں ہیں...... میرے پاپا اور ممی......"

جان کی آنکھیں چھلک پڑیں...... میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ میرے اپنے زخم

ہرے ہو گئے۔

''جان ماں باپ نہیں تو کیا ہوا...... جینی جو ہے...... مجھے دیکھو...... میرا کوئی بھی تو نہیں...... ایک چچا ہیں جو مڈل ایسٹ جا کر سیٹل ہو گئے ہیں۔''

سال بیت گیا......

بڑا جمود تھا اس زندگی میں...... پاور ہاؤس شہر سے دُور تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے سلگتا رہتا...... ٹربائنیں چلتی رہتیں...... بڑے بڑے ٹرانسفارمر بجلی کے بیسیوں میٹر...... تاروں کے پھیلے ہوئے جال یا شفٹوں کے مخصوص دھاروں میں بہنے والے تھکے تھکے الیکٹریشن......

کبھی کبھی جان میس آ جاتا۔ خوب باتیں کرتے...... اور رات گئے تک کیرم کی بازی چلتی۔

''صاب! کسی روز آپ کو جینی سے ملواؤں گا...... وہ کیرم بہت اچھا کھیلتی ہے...... مگر وہ اپنا سٹرائیکر کسی کو نہیں دیتی......''

جان کے ساتھ وقت اچھا کٹ جاتا...... کیرم کی بازی وہ اکثر ہار جاتا تھا...... اور اسی میں اُس کی جیت تھی...... وہ جب رات گئے میس سے واپس جاتا تو ٹائم پیس کی ٹک ٹک کمرے کی تنہائیوں کو اور اداس بنا دیتی۔ میں ان تنہائیوں سے دُور کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔

''کاش! میرے والدین زندہ ہوتے...... چچا عرصے سے مڈل ایسٹ میں مقیم تھے...... ان کا وہاں خاصا کاروبار تھا...... انہوں نے ہی مجھے انجینئرنگ کرائی تھی...... میں نے کئی بار سوچا...... شادی کر لوں...... مڈل ایسٹ چلا جاؤں...... مگر ہر صبح اٹھ کر پاور ہاؤس چلا جاتا...... میں اپنے معمول کے حصار میں مقید ہو کر رہ گیا تھا...... مگر وقت دبے پاؤں چلتا رہا۔

کرسمس سے دو چار روز پہلے جان میرے پاس آیا...... وہ بہت خوش تھا۔ جاتے ہوئے اپنی منگنی کا کارڈ دے گیا۔ کرسمس کی اُس شام کو میں پہلی مرتبہ جان کے گھر گیا۔

وہ شام بڑی رنگین تھی...... سرخ اور سبز روشنیاں جگنوؤں کی طرح جل بجھ رہی تھیں...... اس روز میری ملاقات جینی سے ہوئی...... وہ بہت پیاری، سانولی سی معصوم لڑکی

تھی ...... کسی گڑیا جیسی ...... وہ چہک چہک کر باتیں کرتی ......

منگنی کی رسوم ادا ہوئیں ...... جان کو تحفے دیے گئے۔ میں شیشے کے دو گُل دان لے گیا۔

"جان ...... میری جان! یہ بڑے نازک گُل دان ہیں ...... انہیں سنبھال کر رکھنا جب تمہاری شادی ہوگی تو ان گُل دانوں میں میں پھول سجاؤں گا۔

"کاش آج میرے پاپا اور ممی زندہ ہوتے ...... مگر صاب! اب تو آپ ہی سب کچھ ہیں ......" جان آبدیدہ ہو گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن گئے ...... ساری دیواریں گر گئیں ...... جان نہ تو الیکٹریشن تھا ...... نہ کرسچین ...... وہ ایک معصوم سا انسان تھا ...... پیار اور ہمدردی کا بھوکا دُکھی انسان ...... بہن بھائی کا اس دنیا میں میرے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔

میں اکثر شام کو جان کے ہاں چلا جاتا ...... تو اس کے کوارٹر کے چھوٹے چھوٹے کمرے بے فکر قہقہوں سے گونج اٹھتے ...... جینی کی معصوم ادائیں ...... اور اس کے بے باک قہقہے ...... جان کے ہونٹوں سے پھسلتی مسکراہٹیں اور چہرے پہ ہلکی ہلکی سنجیدگی ...... رات گئے تک کیرم اور تاش کی بازیاں چلتیں۔ جینی ہمیشہ کیرم جیت جاتی۔ اس کے پاس نیلے رنگ کا سٹرائیکر تھا ...... جسے وہ ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتی۔ جب رات گئے میں واپس میس لوٹتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے میں جان اور جینی کو پکچر ہاؤس کی سکرین پر دیکھ کر آ رہا ہوں۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کرتے تھے ...... مگر جب کبھی وہ ایک دوسرے سے روٹھ جاتے ...... تو میں دونوں کو منا لیتا ...... پھر پکچر کا پروگرام بنتا ...... میں ان کے بے باک قہقہوں کو سمیٹے میس لوٹتا ...... اور کمرے کے تنہا ماحول میں ڈوب جاتا۔

سنڈے کو چرچ کے بعد جان اور جینی میس آ جاتے ...... دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاتے ...... شام گئے تک کیرم اور تاش کی بازیاں لگتیں ...... چائے کے دور چلتے۔ جینی واپسی سے پہلے کمرے کی ہر چیز سلیقے سے ٹھیک کر دیتی۔ گرد سے اٹی وردی ...... شیلف پہ

بکھری کتابیں...... چائے کے گندے برتن...... دیواروں پر آویزاں تصویریں...... اور سب سے زیادہ تنہائی کا احساس جو جینی کے چلے جانے سے اور شدید ہو جاتا...... ایک روز جینی یسوع کی تصویر اٹھا لائی۔ اسے کارنس پر سجا دیا۔ چاہنے کے باوجود بھی میں وہ تصویر کارنس سے نہ ہٹا سکا۔

"آپ کو یہ تصویر کیسی لگی......؟"

"تمہاری خوشی کے حوالے سے جینی......"

مگر یہ ساری خوشیاں کانچ کی چوڑیوں کی طرح چھناک سے ٹوٹ گئیں۔

چچا نے مجھے مڈل ایسٹ بلوا لیا تھا...... ویزا پاسپورٹ کا جلد ہی بندوبست ہو گیا۔ جان اور جینی کے ساتھ بیتے خوش گوار دنوں کی یادیں سمیٹے مڈل ایسٹ چلا گیا...... دونوں مجھے ائیرپورٹ پر الوداع کہنے آئے تھے...... جینی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ارے اچھی گڑیا رویا نہیں کرتے۔"

"کیا آپ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"ضرور آؤں گا میری اچھی گڑیا۔"

اس کے تقدس بھرے چہرے پر اداسی کی مہین مہین لکیریں کھنچ گئیں۔ جان مسکرا دیا...... جینی بھی مسکرا دی...... جیب سے رومال نکال کر آنسو جذب کرنے لگی تو جیب میں رکھا کیرم کا سٹرائیکر نیچے گر پڑا...... میں نے اُسے اٹھا لیا۔

"جینی! یہ سٹرائیکر مجھے دے دو......"

"جان! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری شادی میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

پھر میں بیسیوں عہد و پیمان سمیٹے فلائی کر گیا۔ تیل اُگلتے ریگستانوں کی دنیا بہت رنگین تھی...... وہاں عذرا اور سلیم تھے...... اور ان کے بے فکر قہقہے...... آہستہ آہستہ میں اُن میں گھل مل گیا۔

کبھی کبھی جان اور جینی کی یادیں چپکے سے تنہا راتوں میں دبے پاؤں چلی آتیں

اور میں اُن میں اُلجھا نیند کی میٹھی گود میں سو جاتا...... سالوں یہ یادیں سلگتی رہیں۔ جینی...... جس سے آج تک کوئی عہد و پیمان نہ ہوئے تھے...... کوئی کمٹ منٹ نہ تھی...... نہ ایک دوسرے کے لیے آنسو بہائے تھے...... اُس کی بے باک مسکراہٹیں میرے لیے ایک میٹھا درد بن کر رہ گئیں تھیں۔...... جینی میرے لیے کیا تھی...... میں آج تک کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا...... میس کے سرد، تنہا کمرے کی طویل راتوں میں مَیں نے خیالوں کے بیسیوں تاج محل تعمیر کیے تھے...... اس تصوراتی دنیا میں جینی مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی تھی...... مگر پھر بھی مَیں نے اس کو جیٹھ ہاڑھ کی چلچلاتی دھوپ میں پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح محسوس کیا تھا۔ وہ تو میرے لیے صرف ایک کانچ کی گڑیا تھی۔ بات بات پر روٹھ جانے والی...... من جانے والی۔

''کاش جینی کی طرح میری بھی کوئی بہن ہوتی......''

جینی کی جیب سے گرا سٹرانگراب تک میرے پاس موجود ہے مگر جان کی تصویر ٹوٹ گئی ہے شیشوں کے فریم میں جڑی تصویریں ٹوٹتی ہی رہتی ہیں۔ شیشے بدل جاتے ہیں مگر جان جیسے پیارے لوگوں کا بدل نہیں ملتا۔

عذرا اور سلیم میرے کزن ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ تھے...... جو خلوص بھرے لوگ میں کراچی کے تنگ، ویران سے کوارٹروں میں چھوڑ آیا تھا...... جان کی نیلی اُداس آنکھیں اور جینی کے بات بات پر بہنے والے آنسو۔

''کیا آپ لوٹ کر نہیں آئیں گے......''

کاش میں واپس لوٹ سکتا۔

اس زندگی میں بھی ایک جمود سا تھا۔ وہ سارے منظر کہاں گئے۔ بجلی کے بڑے بڑے ٹرانسفارمر...... شور مچاتی ٹربائنیں...... میس کے سرد، اداس کمرے...... لان کے وسط میں ایک چڑ چڑا سا فوارہ...... اور ان سب اُداسیوں میں کھِلی کھِلی جان کی پرخلوص مسکراہٹیں...... کیرم بورڈ کی جیبوں میں پھدکتی گوٹیں...... جینی کے ہاتھ سے بنی سوندھی سوندھی خوشبو والی چائے۔ ہفتے کی وہ طویل راتیں...... جب میں، جان اور جینی رات گئے فلم کا آخری شو

دیکھ کر میس لوٹتے ...... پھر کیرم اور تاش کی بازی چلتی ...... نہ جانے کب تھک ہار کر سو جاتے۔

"صاب آپ ہمارے یہاں آ جائیں ...... آپ چلے جاتے ہیں تو گھر سُونا سُونا ہو جاتا ہے۔"

"جان! تم جلدی جلدی شادی کر لو ......"

"پھر ......"

"پھر میں شیشے کے گلدانوں میں پھول سجاؤں گا ......"

شیشے کے گلدانوں میں مَیں پھول تو نہ سجا سکا۔ البتہ میں نے عذرا کے بالوں میں گلاب کے کئی پھول سجا دیے ...... اس لیے کہ وہ میرے چچا کی لڑکی تھی۔

کئی سال بیت گئے ......

جان کو بیسیوں خط لکھے۔ جواب نہ ملا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ میں تو اُن راہوں سے بہت دُور نکل آیا تھا مگر کون کسی کا انتظار کرتا ہے۔ اس مصروف زندگی میں کسی کو اتنی فرصت ہی کہاں کہ وہ بیتے دنوں کو پکارتا رہے ...... مگر میں جب بھی ماضی میں جھانکتا ہوں تو جان اور جینی کو اپنا منتظر پاتا ہوں ......

کئی برس بیت گئے ......

میں مڈل ایسٹ سے واپس پاکستان آ گیا ...... کراچی میں دو چار روز بڑے مصروف گزرے۔ مجھے کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں ایک معقول ملازمت اور ایک اچھا سا گھر مل گیا۔ ایک روز مَیں شام ڈھلے جان سے ملنے گھر سے نکلا ...... اکیلا تھا ...... وہی جگہ تھی ...... سلگتا ہوا ابو اکبر ہاؤس ...... شور مچاتی ٹربائنیں۔ کوارٹروں کی لمبی لمبی قطاریں ...... میں نے جان کے دروازے پر لمبی سی دستک دی۔

"جان ...... تم کہاں ہو ...... جان"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان تاریک کوارٹروں نے میری آواز کو نگل لیا ہو۔

"جان ...... جینی ...... تم لوگ کہاں ہو ......؟" آج پھر میں اکیلا تھا اور یوں محسوس

ہو رہا تھا جیسے میں میس کے اداس کمرے سے بھاگ کر آیا ہوں۔

''جینی! دیکھو کون آیا ہے...... جان...... !''

میں نے دو چار بار دستک دی...... تاریک برآمدے سے چار چمگادڑ راتے ہوئے باہر نکل آئے...... اور ان کے پروں کی آسیبی آواز دور کھمبوں کے پاس سنائی دی۔ غور سے دیکھا تو دروازے پر کار پوریشن کا تالہ پڑا تھا۔

''کون جان...... کون جینی......''

کہیں میں خوابوں کی دنیا میں تو نہیں بھٹک رہا...... حقیقت تو عذرا ہے...... ننھا آصف ہے۔ میں نے جان سے متعلق کوئی کہانی پڑھی ہوگی جو اس آسیبی ماحول میں تصوراتی لوگوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔

وقت کے خاموش دھارے بہتے رہے۔

میری نظریں جان اور جینی کی متلاشی رہیں۔ ایئر پورٹ۔ کیماڑی۔ بندر روڈ۔ گاندھی گارڈن۔ جان انہی راہوں پہ ملا تھا...... یہیں کہیں کھو گیا...... انہی گلیوں میں لوگ ملتے ہیں...... بچھڑ جاتے ہیں...... اور پھر کبھی نہ کبھی...... کہیں نہ کہیں مل جایا کرتے ہیں۔ سنڈے کو گرجے کی گھنٹیاں بجنے لگتیں...... تو میں ان راستوں پر جان کو تلاش کرتا مگر وہ مجھے کہیں نہ ملا...... امیدیں ٹوٹ گئیں...... میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ شاید وہ لوگ انہی راستوں پر کہیں مل جائیں...... یہیں سے بچھڑے تھے...... اور پھر اُن سے ملنے کی امید کا شدید احساس تھک کر ہار گیا...... اُمیدیں ٹوٹ گئیں...... اور ٹوٹی کشتی کی طرح وقت کے دھاروں پہ بہتا رہا......

عذرا کا دوسرا بچہ ہونے والا تھا...... سوچا کہ اسے اس کے ماموں کے ہاں پنڈی چھوڑ آؤں...... آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائے گی اور عذرا کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح سے ہو سکے گی...... پنڈی روانہ ہو گئے...... سردیوں کا یہ سفر طویل مگر خوش گوار تھا۔ برسوں بعد پنڈی جا رہا تھا...... سفر کا احساس ماضی کی یادوں میں ڈوب گیا۔ صدیوں کا ریگستان سندھ سر سبز ہو چکا تھا۔ جانے لاہور کتنا بدل چکا ہوگا...... جہاں میں نے چھ سال کالج اور یونیورسٹی

میں گزارے تھے...... وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے...... دس سال پلک جھپکنے میں گزر گئے۔اس مختصر مگر طویل مدت میں جانے کیا کچھ ہوگیا...... میرا بچپن کھوگیا...... عذرا ملی...... ننھا آصف آیا...... جان اور جینی ملے اور کہیں کھوگئے۔

''عذرا یہ میری یادوں کا شہر لاہور ہے...... جہاں میں نے اپنی زندگی کے خوب صورت ترین لمحے گزارے ہیں...... بھولی بسری یادیں اس شہر کی ہر اینٹ تلے سو رہی ہیں۔''

گاڑی کافی دیر لاہور سٹیشن پہ رکی...... گاڑی جانے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں اور عذرا پلیٹ فارم کے بک سٹال سے اخبار خریدنے لگے تو اچانک کسی نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''ارے جینی تم......''

''ہاں بھیا......'' وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی...... اور سسکیاں لینے لگی۔

''ارے! ارے...... ارے۔کیا ہوگیا تم کو......''

میں نے اس کی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں والے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیا''جینی...... !اچھی گڑیا رویا نہیں کرتے۔'' یہ برسوں پرانی یادوں کا Re-play تھا۔

''بھیا! یہ تو خوشی کے آنسو ہیں......''

''جان کیسا ہے......؟''

''مزے میں ہے......''

میں نے عذرا اور جینی کا تعارف کرایا۔جینی کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے جنہیں میں نے چوم لیا۔

''بھیا! یہ دونوں میرے بچے ہیں۔بلّو اور گوگی اور یہ میرے ہسبنڈ مسٹر ڈیوڈ......''

ڈیوڈ نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا...... اور آصف سے پیار کرنے لگا۔کافی دیر باتیں ہوتی رہیں...... اب کی باتیں...... گزری باتیں...... اور جان کی باتیں...... جینی نے اپنا ایڈریس دے دیا۔

"جینی میں کچھ دنوں تک ضرور لاہور آؤں گا...... جان سے ملنے...... وہ کیسا ہے......؟

مزے میں ہے...... یہاں لاہور ہی میں رہتا ہے...... بھیا آپ کو ضرور آنا ہو گا...... میں انتظار کروں گی......"

گاڑی چل دی۔ مگر متوازی لائنوں کی طرح...... یادیں وقت کے طویل فاصلوں تک پھیل گئیں...... ہم کتنا سفر کاٹ آئے تھے مگر یادیں وہی تھیں۔ پنڈی کچھ روز مصروف رہا...... دسمبر کے آخری ہفتے میں لاہور جانے کا پروگرام بنایا...... جینی کو تار بھیج دیا۔

Reaching on Chrismas Afternoon

جینی اور ڈیوڈ دونوں مجھے سٹیشن لینے آئے تھے...... میں ان کے بچوں کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لے گیا تھا...... کرسمس کی وجہ سے ان کے گھر خوب رونق تھی...... چھوٹا سا صاف ستھرا گھر...... ڈرائنگ میں جان کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔

"جینی! جان سے تو ملواؤ...... وہ کہاں غائب ہے؟"

"بھیا! وہ مجھ سے الگ رہتا ہے۔ اُس نے ایک الگ گھر آباد کر لیا ہے۔ تم تو برسوں پرانی باتیں کر رہے ہو جب میں اور جان اکیلے ہوا کرتے تھے......"

جینی کے لہجے میں شکایت بھری تلخی تھی۔

"اتنی دیر کون کسی کے ساتھ رہتا ہے...... وہ مجھ سے کچھ خفا بھی ہے......"

اس کے چہرے پہ پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ بڑا بے وفا ہے...... اس کا میرے علاوہ دنیا میں تھا بھی کون......"

میں نے جینی کو حوصلہ دیا۔

"جینی تم کو یاد ہے...... جب تم دونوں روٹھ جاتے تھے تو میں ہی منانے آیا کرتا تھا۔"

"بھیا! جان وہ نہیں رہا جو ہوا کرتا تھا...... تم کوشش کر لو......"

کارنس پر نئی جان کی تصویر مسکرا رہی تھی ...... اور اس کی منگنی میں دیے میرے شیشے کے گُل دانوں میں کاغذوں کے پھول سجے تھے۔

''جینی ...... ! میں جان کی شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اُس کی شادی پر میں ان گُل دانوں میں پھول سجاؤں گا ...... آج ہم اُسے سرپرائز دیں گے۔

جینی باولِ نخواستہ اُس کے گھر جانے کے لیے راضی ہو گئی۔

بازار سے ہم نے نرگس کے دو گلدستے خریدے۔

ٹیکسی میں جان کے ہاں چل دیے

جینی تمام راستے خاموش رہی ...... شاید جان کی کسی بات سے صدمہ ہوا تھا۔

شام شہر کی گلیوں میں روشنیوں سے چھپ چھپا کر اتر رہی تھی۔

ٹیکسی بازار سے نکل کر ایک سنسان سے محلے کی طرف مڑ گئی ......

ایک جگہ جینی نے ٹیکسی رُکوا دی ......

ہم پیدل چلنے لگے ...... گلی میں کافی اندھیرا تھا ......

ہم ایک بوسیدہ سی حویلی کے نیم وا دروازے کے سامنے رک گئے ......

جینی نے مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔

''آؤ بھیا! تم کو جان سے ملاؤں ......''

حویلی کے بڑے پھاٹک سے آگے پتھریلا راستہ بہت تاریک تھا۔

پاؤں تلے خزاں رسیدہ پتے خرمراتے تھے ......

دُور آگے ایک مریل سی روشنی جھانک رہی تھی۔

جینی چلتی ہوئی اُس سوگوار روشنی تک چلی گئی جہاں کئی موم بتیاں آنسو بہا رہی تھیں۔

''یہ رہا تمہارا جان ......''

...... جینی ایک قبر کے سہارے رک گئی۔

دم توڑتی موم بتی کی ڈگمگاتی روشنیوں میں بھی سنگِ مرمر کی تختی روشن تھی۔

Here lies Mr. John

From Chrismax 1965

May his soul be in peace.

شیشے کے گلدان میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئے.......

یادوں کی مہین مہین کرچیں زندگی کی طویل راہوں پہ بکھرتی چلی گئیں۔

"جینی! اچھی گڑیا...... رویا نہیں کرتے......"

میں جینی کو سمیٹنے لگا......

مگر میں تو خود بکھر گیا تھا......

آنسو پونچھنے کے لیے جب میں نے کوٹ سے رومال نکالا تو اس میں جینی کا

برسوں پہلے دیا کیرم کا سٹرائیکر پڑا تھا۔

"جینی......! اپنا سٹرائیکر واپس لے لو......"

□□□

پچھتاوا

وہ لمحہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا...... سارے خواب...... تمام سوچیں شیشے کے گل دان کی طرح چکنا چور ہوئے۔ وہ بنچ سے ادھوری سی اُٹھی...... کچھ چلی گئی...... کچھ بنچ پہ بیٹھی رہ گئی اور ایک موہوم سا سایہ اس اُداس شام کے سرمئی اندھیروں میں کھو گیا۔

''شان! تم نے بہت دیر کر دی۔''

مگر ابھی تو ابتدا بھی نہ ہوئی تھی یا شاید بہت پہلے ہو چکی تھی جو فیصلے کی گھڑی سر پہ آن پہنچی۔ بنچ پر بکھری وہ کتابیں میں نے سمیٹ لیں جن کے ورق ورق پہ میرے خواب لکھے تھے۔ ایک ہی جیسے سارے خواب بلکہ ایک ہی خواب تھا۔ سوچ کے آمنے سامنے آویزاں آئینوں میں ایک ہی صورت بہت دُور تک دکھائی دے رہی تھی...... کاش میں نے دستِ طلب نہ اُٹھایا ہوتا۔ یہ ہاری ہوئی ریس میں اگلے سالوں میں اکیلے اپنے مقابل کیسے دوڑ سکوں گا...... مگر اس سے کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ میرے سارے خواب بند کتابوں میں لکھے تھے اور کتابیں میرے ہاتھوں میں تھیں۔ چہرے پہ کیا تحریر تھا۔ آئینہ دیکھنے والے کو تو صرف اپنا چہرہ اور اپنی آنکھیں نظر آتی ہیں، دل تو وجود کے بہت اندر بے آواز دھڑکتا ہے۔ گنبد کے اندر کی آواز اس کی مقدس گولائیوں کے حصار میں رہتی ہے۔ اور جب اندر کی باتیں اندر ہی رہ جائیں تو ایسی ہی اُفتاد پڑتی ہے۔ جیون راستے ایسے جدا ہوتے ہیں کہ پھر کبھی مل نہیں پاتے۔ سارا سفر رائیگاں جاتا ہے۔ خواب نہ ٹوٹتے تو شاید اُمید کے سراب

راستوں پر تھکے قدموں سے چلتے ہی رہتے اور یوں شام ہو جاتی۔ شام تو اب بھی اتر آئی تھی۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی جملے کی ضرب سے سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

شان! تم نے بہت دیر کر دی۔

دیر تو میں ہمیشہ کر دیتا ہوں...... کچھ سوچنے میں دیر کر دیتا ہوں...... کوئی فیصلہ کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اُلجھا ہوا پھولوں اور کیاریوں میں بھاگتا رہتا ہوں۔ تتلی اُڑ جاتی ہے۔ کسی کا دامن تھامنے میں دیر کر دیتا ہوں...... کوئی غلط دامن ہاتھ آ جائے تو چھوڑنے میں دیر کر دیتا ہوں...... ایک سال کے سارے موسم ہم نے لان کے بنچ اور لائبریری کی میز پر بیٹھے گزار دیے۔ عرض مدعا پیش کرنے میں میں نے دیر کر دی۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، انسانی رویے اور ان کے اثرات پہ مہینوں بحث کرتے رہے...... مگر محبت بھرے چہرے ہم نے کورس کی کتابوں کے پیچھے چھپا رکھے تھے۔ انا کے اس کھیل میں ہم نے اپنے اپنے سچ کسی ہار جیت کے خوف سے ایک دوسرے سے چھپا رکھے تھے۔ کم سن بچوں کی طرح ہم ریت کے گھروندے بناتے رہے...... توڑتے رہے۔ مگر سب کچھ علیحدہ علیحدہ اور اپنا اپنا تھا۔ مگر کچھ بھی اپنا نہ تھا...... ایسے ہی میں نے یونیورسٹی داخلہ لینے میں دیر کر دی۔ اُردو ڈیپارٹمنٹ میں عائشہ سے ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں پہلی ملاقات ہوئی۔

عائشہ! یہ تمہارے نئے کلاس فیلو ہیں مسٹر شان، ذرا late comer ہیں۔ انہیں ڈیپارٹمنٹ کی روٹین اور procedure سمجھا دو...... اور سابقہ نوٹس میں بھی ان کی مدد کرو۔

میں نے غور سے عائشہ کو دیکھا...... محسوس کیا۔ غالباً یہیں سے میری زندگی کی ابتدا ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کے پھاٹک کے پار صرف ایک سیاہ لکیر تھی جو میرے ازل تک بچھی ہوئی تھی۔ دھول بھرے راستوں پہ چل کر روشنیوں کے شہر میں آیا تھا۔ اس چکاچوند میں کچھ صحیح سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جو میں دیکھ رہا تھا وہ تو عجیب روشنی تھی...... اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں تھیں...... مسکراتے ہوئے لب تھے۔ ٹھوڑی کے نیچے ایک ہلکا سا خم تھا...... گردن اپنی خوبصورت گولائیوں میں لپٹی وجود کے کاندھوں سے خوشگوار لمبائی تک اٹھی ہوئی تھی...... وجود

کیا تھا، بلبلے بلبلے...... اُبھرتے ڈوبتے دائرے ایک دوسرے سے لپٹ کر ایک وجود بنا رہے تھے۔ سراپا کیا تھا مناسب سے بھی زیادہ مناسب تھا...... میری آنکھیں جو صرف کتابوں پہ لکھے حرف پہچانتی تھیں...... کسی چکا چوند کا شکار ہو گئیں۔ دوشیزائیں تو میں نے کنویں کو جانے والے گاؤں کے راستوں پہ بھی دیکھی تھیں...... کھیتوں کی پگڈنڈیوں، منڈیروں پر میں نے معصوم روشن چہرے دیکھے تھے...... مگر وہ میرے لیے کاغذوں پر چھپے ہوئے چہرے کی طرح تھے اور میں کورآنکھوں والا مدرسے کے حافظ کی طرح سر جھکائے اپنی منزلیں یاد کر رہا تھا۔ پھر گاؤں سے نکل آیا۔ پیچھے کیا چھوڑ آیا تھا۔ چھوڑنے کے لئے میرے پاس تھا ہی کیا، نہ کوئی حادثہ تھا، نہ کوئی چوٹ تھی...... نہ گیت تھے...... نہ آنسو تھے...... نہ کوئی یادیں تھیں...... نہ میرے پاس کسی کی ٹوٹی چوڑیاں تھیں...... نہ کسی کا رومال تھا...... میں نے تو کورس کی موٹی موٹی کتابیں جوڑ کر ایک سیڑھی بنائی تھی۔ محتاط قدموں سے ادھر اُدھر دیکھے بغیر ایک ایک کتاب کی منزل بڑے متوازن انداز میں طے کر رہا تھا کہ کہیں دھیان بٹا تو اس نازک سیڑھی سے گر جاؤں گا۔ پھر میں نے یونیورسٹی کے پھاٹک پہ دستک دی۔ تو زندگی میرے روبوٹ وجود میں شاید پہلی دفعہ در آئی۔

''مسٹر شان! لائبریری تشریف لایئے۔''

اس کے قدموں کی چاپ پر میں لاٹھی ٹیکتا ہوا لائبریری کی ایک بڑی سی میز کے ایک کونے پہ بیٹھ گیا۔ وہ ایک اُستانی کی سی بے گانگی اوڑھے مجھے پچھلے سبق از بر کراتی رہی...... کچھ نہ سمجھا، کچھ سمجھتے ہوئے بھی اُلجھ سا گیا...... مگر میں وہاں تھا کہاں...... وہاں تو ایک مٹی کا مادھو کہنیاں میز پر ٹکائے...... ہتھیلیوں کے پیالے پہ سر دھرے مدرسے کے طالب علم کی طرح جی جی کر رہا تھا...... خود تو میں وہاں سے بہت دُور اپنے ازل پر میاں جی کے حجرے میں آن گرا تھا۔ میں تو ابھی تک خوف اور جھجک کے اس دائرے سے باہر نہ نکل پایا تھا، جہاں میں پہلی دفعہ سفید ٹوپی پہنے چھوٹی سی رحل اور بغدادی قاعدہ اُٹھائے میاں جی کے حجرے میں اُن کے سامنے اپنے دادا کے ہمراہ زانوئے تلمذ طے ہوا تھا۔ میاں جی بڑے

گرد فرسے چارپائی پہ براجمان تھے۔ تسبیح کی گی والا ٹوپی سنہری ٹلا و سر پہ لیے...... چار خانے کا ریشمی رومال کاندھے پر رکھے۔ کریم رنگ کی ریشمی واسکٹ پہنے جس کی سینے والی جیبی گھڑی کی سنہری زنجیر واسکٹ کے کاج میں مقفل تھی...... چہرے پہ سرخ شرعی داڑھی...... ہاتھ میں کھوئی پتلی چھڑی...... عطر کی تیز خوشبو...... ستھرا اور اگر بتی کی ملی جلی خوشبو سے حجرے کی فضا بوجھل ہو رہی تھی...... میاں جی کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر روشنی بھی جھجک جھجک کر دبے پاؤں حجرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں میاں جی کے قدموں میں بیٹھ گیا اور وہاں سے آج تک نہ اُٹھ سکا...... خوف اور جھجک کی کینچلی سال بہ سال اُتار تا رہا مگر پیاز کی گڈھی کے اُترنے والے چھلکے کے نیچے ایک اور پرت موجود ہوتی۔ شاید یہ جھجک اور خوف میرے بہت اندر تک موجود تھا۔ وہ جھکی جھکی آنکھوں سے کاغذ پہ لکھا پڑھ رہی تھی اور میں بچھی بچھی آنکھوں سے اس کے چہرے پہ لکھا پڑھ رہا تھا۔

مسٹر شان کچھ نوٹ بھی کر رہے ہیں یا نہیں...... کل میں ان سب کی فوٹو سٹیٹ دے دوں گی۔ اس نے سب notes کو فائل میں ٹیگ کیا۔ فائل سمیٹی اور مسکرا کر سلام کر کے چلی گئی۔ میز سے میں نے سادہ کاغذ اُٹھایا جس پر میں ابھی تک کچھ نہ لکھ سکا تھا...... میز سے اُٹھنے لگا تو خود کہیں کھو گیا...... ٹٹولا...... تلاش کیا...... آوازیں دیں...... میں شاید میاں جی کے حجرے میں بھی نہ تھا۔ کرسی پر تو صرف ایک ڈھانچہ بیٹھا تھا...... جو اندر سے خالی تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ عائشہ نے جہاں فائل میں نوٹس ٹیگ کیے تھے، وہاں ایک سادہ کاغذ بھی پرو لیا تھا۔ چلو اپنی کچھ خبر تو ملی۔ ہاسٹل کی وہ پہلی شام...... دریا کے کنارے اُترتی ہوئی شام کی طرح تھی جب ملاح کشتیوں کے بادبان سمیٹ کر چپوار اُٹھائے اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا چکے ہوتے ہیں۔

اگلی صبح عائشہ نے سب نوٹس کی کاپیاں مجھے دے دیں۔

مس! ان کاپیوں کے چارجز...... ؟

یہ میری طرف سے ہیں۔ وہ مسکرا دی۔ ذرا سی حدت سے میں موم کی طرح پگھل

خرچ ہونے سے کوئی کچھ خرید لیتا ہے یا کسی کو خرید لیتا ہے۔ پھر تو یوں اسیر ہوئے کہ خواہشیں، جذبے، خواب اور خوشبو سب پابند سلاسل ہوئے...... قوت اظہار بھی سلب ہوئی۔ پھر تو صرف سوچا کیے اور دیکھا کیے...... سوچوں کی خالی ڈبیاں جوڑ کر روزانہ خوابوں کا ایک گھر بناتا...... اور ہر روز وہ ٹوٹ جاتا...... مگر آس کی ڈور کبھی نہ ٹوٹی...... مگر وہ تو ایورسٹ کی بلندی پر بیٹھی تھی اور میں اس کے قدموں میں اوپر جانے والے راستے تلاش کر رہا تھا...... راستے تو ہمارے ایک ہی تھے۔ یونیورسٹی ایک تھی۔ کلاس بھی ایک تھی...... subject بھی یکساں تھا اور اتفاق سے دونوں شمالی پنجاب سے آئے تھے۔ تمام گلیاں ایک ہی راستے پر آملی تھیں...... اور سال کا طویل سفر ابھی باقی تھا۔ ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ یہ راستہ طے ہوگا تو پھر کچھ فیصلہ کریں گے...... مگر گھڑی نے اپنا راؤنڈ مکمل کرنے سے پہلے الارم بجا دیا۔

شان! تم نے بہت دیر کر دی۔

عائشہ کے چہرے پر دھنک کے ساتوں رنگ جل بجھ رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے بھیگے جملوں میں نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔

ریت پر بیٹھ گھروندے بنانا اور بچوں کی طرح شام ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جانا اور بات ہے...... اور زندگی بھر کے سفر میں کسی کا ہاتھ تھام لینا اور ایک ہی گھر کی دہلیز پار کرنا سو تقاضوں کا متقاضی ہے...... لان کے بیچ پر بیٹھ کر ہم پہروں گفتگو کیا کرتے تھے...... غالب، میر اور اقبال کو discuss کرتے مگر تم نے کبھی بھول کر بھی میرے ہاتھ کی لکیروں میں اپنا نام تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی...... میری سالگرہ پر تم نے مجھے ایک wish card تک بھی نہیں بھیجا۔ میرے بتانے پر تم نے افسوس کا اظہار کیا۔

عائشہ! تمہاری زندگی کا ایک اور قیمتی سال ماضی کی کھائیوں میں گر گیا ہے۔

تمہاری کتابوں کے ورق ورق میں نے ڈھونڈ ڈالے...... کاغذ کے کونے میں شاید میرا نام ہی لکھا ہو...... مجھے کہیں بھی کوئی حوالہ نہ ملا...... کوئی ڈور میرے ہاتھ نہ لگی، جس

کو میں پکڑ لیتی ...... سوچنے والوں نے فیصلہ کر ڈالا ...... انکار کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا۔
ایسا بھی نہیں ہے کہ کمسن بچے کی طرح جس کو میں نے انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ چلنا سکھایا تھا،
وہ اگر میری انگلی پکڑے رکھتا تو میں اس کا ہاتھ جھٹک دیتی ...... شان تم کسی لمحے مجھ سے جدا
نہیں ہوئے ...... لان کے بنچ پر ...... لائبریری کی میز پر، بلکہ میری سوچوں اور میرے خوابوں
میں بھی تم میرے ساتھ رہے ...... اپنے دست و بازو اپنے وجود سے کوئی کیسے جدا کر سکتا ہے۔
summer vacations میں میں نے تم کو دو طویل خط لکھے۔لڑکی ہونے کے ناتے
جھجک نے میرے ہاتھ باندھ رکھے تھے ...... انا کا تالا میری زبان پہ لگا تھا ...... جو اظہار میں
تمہارے ہاتھ پکڑ کر نہ کر سکی وہ کھلے لفظوں میں خطوں میں لکھ دیے۔ مگر تمہاری طرف سے
کوئی جواب ہی نہ آیا۔ شاید تمہاری کوئی مجبوریاں ہوں گی۔ اب روتے کیوں ہو؟ تمہاری
کوئی reservation تو تھی نہیں ...... کسی اور نے ٹکٹ لیا اور میرے ساتھ والی خالی سیٹ پر
بیٹھ گیا ...... وقت کی گاڑی کسی کا انتظار نہیں کرتی، وہ اپنے شیڈول پر سٹیشن چھوڑ دیتی ہے۔
ایسے میں ڈوبتی ہوئی شام کو کوئی پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھا رہ جائے اور کوئی کسی کے ساتھ بیٹھ
کر گاڑی میں چل دے۔ تنہا رہ جانے والا کیسے اپنے آپ کو سنبھالے گا۔ اس کو میٹنے والے
ہاتھ تو کسی اور کی گرفت میں ہوں گے ...... کاغذوں پر انگوٹھے لگ جائیں تو سوچیں بھی اپنے
اختیار میں نہیں رہتیں ...... گناہ ثواب کی حد لگ جاتی ہے۔ تم کو اور اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر
یونیورسٹی کے اس پھاٹک سے باہر میں کسی اجنبی کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر زندگی کی نئی
راہوں پر روانہ ہو جاؤں گی، مڑ کے بھی نہ دیکھ سکوں گی اور یوں تم لان کے بنچ پر دھوپ جلی
شام کو اکیلے بیٹھے کیسے survive کرو گے۔

survive میں کیا کرتا۔ عائشہ پھاٹک کے در بند کر کے کنڈی باہر سے لگا کر اپنی
کتابیں اور اپنی یادیں سمیٹ کر جھگیوں والے فقیروں کی طرح اپنا خیمہ اکھاڑ کر چلی گئی۔
لان کا بنچ تھا، تنہائی تھی۔ کچھ کھو جانے والی سوچ کی آگ تھی اور میرے آنسو تھے۔ یوں میں
آگ میں جلتا رہا اور آنسوؤں سے بجھتا رہا۔ بے در اور بے گھر مسافر کی طرح جو کسی پلیٹ

فارم پہ اُترتا ہے اور اس کی اگلی گاڑی چھوٹ جاتی ہے۔ منزل تو اس کی گم ہو ہی جاتی ہے، وہ واپسی کا راستہ بھی کھو دیتا ہے۔

سردیوں کی چھٹیاں ہوئیں۔ سب لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہاسٹل میں مَیں اکیلا رہ گیا...... میں تھا، کتابیں تھیں...... ایش ٹرے تھی اور جلتے بجھتے سگریٹ تھے۔ ایک گمبھیر تنہائی تھی۔ ایسے میں میں اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا اور خود ہی اپنے آپ کو جواب دیتا۔ میں پہلے کہاں تھا جو یوں اپنے آپ سے آن ملا...... شاید میں اپنے بہت اندر تھا، گھٹن تیز ہوئی...... تنہائی گمبھیر ہوئی تو اندر باہر نکل آیا۔ جو لوگ توازن کھو بیٹھتے ہیں، اکیلے میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں اصل میں ان کے اندر کا آدمی باہر نکل آتا ہے۔ پھر وہ قابو نہیں آتا۔ واپس اندر بھی نہیں جاتا۔ کون ویران اجڑے اندر میں واپس جاتا ہے بارش میں بھیگی اور دھند میں لپٹی وہ رات بڑی اُداس تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے ٹھٹھرتی روشنی میں نظر آنے والا یونیورسٹی گراؤنڈ پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس سے آگے مٹی کے ٹیلوں پر اُترے ہوئے جھگیوں والے فقیر ایک بڑے سائبان کے نیچے آگ کا بڑا سا الاؤ روشن کیے چمٹے، سارنگی اور طبلے کے ساز پر سرائیکی کا کوئی درد بھرا گیت گا رہے تھے...... وہ روشن آگ...... وہ گیت، مجھے یوں لگا جیسے دُور طور پہ کوئی آگ جل رہی ہو اور کوئی غیبی آواز مجھے اپنی طرف بلا رہی ہو...... وہ عجیب روشنی تھی۔ روشنی تو میرے کمرے میں بھی تھی...... بے حس...... سپاٹ...... کفن پہنے مردے کے چہرے کی طرح وہ دودھیا روشنی جو مجھ جیسے بے بس کے اختیار میں تھی...... روشنیوں کے بھی اپنے اپنے مزاج اور رویے ہوتے ہیں...... موم بتی...... روتی ہوئی معصوم بچی کی طرح قطرہ قطرہ جلتی ہے۔ اپنا اندر روشن رکھتی ہے اور اپنا باہر جلاتی رہتی ہے۔ یوں روتے روتے سو جاتی ہے۔ مٹی کا دیا کسی کا جل گھر میں بیٹھا، کسی راہب کی طرح قبر کے سرہانے مراقبے میں دوزانو بیٹھا رات بھر تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ سحر اُترتی ہے تو وہ اپنی روشنی سمیٹ لیتا ہے۔ پھلجھڑی چھوٹتی ہے تو شام دیر سے لوٹنے والی بارات کے استقبال کے لئے ایک لمحے کو سو رنگوں کے پھول فضا میں بکھر جاتے ہیں اور دوسرے لمحے اُترتی ہوئی رات

سارے روشن پھول اپنی کالی چادر میں لپیٹ لیتی ہے۔سب روشنیاں آسمانوں سے اُترتی ہیں...... بادلوں کی اوٹ سے آسمانی بجلی اچانک کڑک کے ساتھ دھرتی کو لپکتی ہے۔سارا جہاں روشن ہو جاتا ہے۔سب آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔مرغی کے چوزوں پر جھپٹنے والی چیل کی طرح کئی خرمن جلا کر اپنے گھونسلے میں واپس چلی جاتی ہے...... جلتی بجھتی لالٹین کھڑکی میں بیٹھی دوشیزہ کے ساتھ واپس لوٹ کر نہ آنے والے کے انتظار میں رات بھر سوگوار رہتی ہے۔

اپنی دسترس میں میں نے ساری بتیاں گل کر دیں۔چوکیدار رضائی اوڑھے گہری نیند سویا ہوا تھا۔خاموشی سے wicket گیٹ کھولا۔بارش میں بھیگتا ہوا سائبان کے نیچے پہنچ گیا۔آگ کے الاؤ کے ارد گرد دائرے میں بیٹھے تمام مست ملنگ سرائیکی میں کوئی درد بھرا گیت گا رہے تھے۔گیتوں کے بول کیا تھے، مجھے صحیح ادراک نہیں ہو رہا تھا۔مگر درد کی ایک چبھن ٹھیکری کی طرح زخموں پر محسوس ہو رہی تھی۔ساز ٹوٹا تو گیت لپیٹ دیا گیا۔نیم مدہوش آنکھوں سے انھوں نے میرا سواگت کیا۔دائرے کے وسط میں رکھا مٹی کا ایک پرانا پیالہ مجھے پیش کیا جو گاڑھے سیال مشروب سے بھرا ہوا تھا...... میں نے دو چار گھونٹ ہی پیے، اندر آگ سی لگ گئی۔پھر دھیرے دھیرے دل میں سلگتی ہوئی آگ بجھتی چلی گئی...... میں ایک عجیب نا آشنا سی میٹھی میٹھی نیم خوابیدہ کیفیت سے سرشار ہوتا گیا...... اتنا سمٹ کر تو میں اپنے اندر کبھی نہ آیا تھا......

ہم بھی عجیب لوگ ہیں۔ضرب تقسیم، جمع تفریق، ناپ تول، سود و زیاں کے کتنے پیمانوں سے اپنی زندگی کو ناپتے ہیں، پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پوٹلیوں میں باندھ کر پوری عمر کی دھول بھری راہوں پر فاصلے فاصلے پر رکھ دیتے ہیں...... یوں سفر شروع ہوتا ہے۔جیسے جیسے سفر کٹتا جاتا ہے ہر سنگِ میل سے پوٹلی اُٹھاتے جاتے ہیں اور گٹھڑی میں باندھتے جاتے ہیں۔دکھوں کا یہ بوجھ اُٹھاتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔بیٹھ جاتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں...... اور ہمارے پیچھے آنے والے قافلے سارے ٹکڑے سمیٹ کر چادر میں ڈالتے ہیں اور

ہمیں زیرِ زمین اُتار کر آگے چلے جاتے ہیں...... اور اس محدود دائرے میں بیٹھے یہ بے فکرے لوگ صرف اپنے آج میں زندہ رہتے ہیں۔ کل کی سلگتی ہوئی ڈھیریاں وہ پچھلے گاؤں میں چھوڑ آتے ہیں...... آنے والی کل کی خبر نہیں رکھتے۔ وہ ہر روز کی دہلیز سے اُٹھتے ہیں۔ ان کی عورتیں ایک ٹوکرے میں مٹی کے گھوڑے لادے قصبے کو چل پڑتی ہیں۔ نیم برہنہ اور ننگے پاؤں بچوں کی ایک بارات اُن کے ہمراہ چل پڑتی ہے...... اور گاؤں قصبے کی گلیوں میں بٹ جاتے ہیں۔ عورتیں مٹی کے کھلونے بیچتی ہیں اور بچے دروازوں پہ دستک دے کر روٹی کی بھیک مانگتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ سورج روشنی کی بساط لپیٹے وہ اپنے ڈیرے پہ واپس آ جاتے ہیں۔ اُن کے مرد جوہڑ سے چکنی مٹی کھود کر لاتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح گوندھتے ہیں اور اس سے مٹی کے کھلونے بناتے ہیں...... بھیک میں مانگی مختلف ذائقے کی روٹیاں کھاتے ہیں اور اسی مٹی کے فرش پر سو جاتے ہیں...... کبھی کبھی مرد بھی رزق کے حصول کے لئے بندر اور ریچھ کے ہمراہ چل دیتے ہیں عاجزی، انکساری، صبر، شکر...... ہماری اور اُن کی راہیں کتنی مختلف ہیں...... وہ اپنے ہر دن کا دروازہ شام کو بند کر دیتے ہیں۔ رات کا دروازہ رات ہی کو کھولتے ہیں...... ایک بڑی سی آگ جلاتے ہیں۔ اس کے گرد دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں...... چمٹے...... سارنگی اور طبلے کے ساز پر گیت گاتے ہیں...... گاڑھا سیال دارو پیتے ہیں...... اگر کچھ تحلیل ہونے سے بچ جائے تو اسے ڈبل سگریٹ میں سلگا کر مدہوش ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اگلی صبح کا سورج اُن کے بے در جھونپڑوں پہ دستک دے دے کر انہیں اُٹھا دیتا ہے اور یوں وہ روز کا حساب روز چکا دیتے ہیں...... اور ہم نرم بستر پر نیند میں بھی مکمل نہیں سو پاتے۔ ہماری پریشانیاں، اندیشے، ضرورتیں وہ بھی ہمارے ساتھ ہمارے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ ہمیں سکون سے سونے نہیں دیتیں۔

صرف تین راتیں...... الاؤ کی اُس آگ سے میں کندن بن کے نکلا تھا۔ پیالے کے مشروب میں ساری کثافتیں تحلیل ہو گئی تھیں۔ کچھ کھو جانے کا دُکھ ڈبل سگریٹ کے

ساتھ جل کر سُرمئی دھوئیں میں تبدیل ہو چکا تھا...... اس روز تو میرے ساتھ جاگ جاگ کر رات بھی تھک گئی تھی۔ جب وہ سُرمئی اُجالے کی چادر اوڑھ کر سونے گی تو میں بھی سو گیا۔ گہری اور پُرسکون نیند کے بعد پچھلے پہر کہیں جا گا...... وہ بہت روشن دن تھا...... سامنے نیلے والے فقیر اپنا سب کچھ سمیٹ کر کہیں جا چکے تھے...... وہ تو کوئی خواب تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ وہ تو غیر متعلق لوگ تھے، چلے گئے...... لیکن جس کے ساتھ زندگی کی آخری حدوں تک ہاتھ پکڑ کر چلنے کا سوچا اور جس نے نانک کے جھولتے رسے پر چلنے کا مجھے ہنر سکھایا...... وہ میرا توازن چُرا کر چلی گئی...... اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ شاید اس کے پاس اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یا اختیار تو وہ مختار نامے کے اشٹام پر لکھ کر دے چکی تھی...... چوٹ میرے بہت اندر تک تھی۔ ایک عرصہ تک میں دارو پیتا رہا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے نکور ہوتی رہی۔ ایک سال کے طویل عرصہ میں زخم اوپر سے مندمل ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی اندر سے ایک ٹیس سی اُٹھتی تو میں داروکی overdose لے لیتا۔ جمعرات کی شام سائیں کی سرکار حاضر ہو جاتا۔ میرے سمیت وہاں سیکڑوں بھکاری اپنی حاجتوں کی جھولی پھیلانے حاضر ہو جاتے۔ شام ہوتے ہی چراغ جل اُٹھتے۔ دُکھوں کے اندھیرے غائب ہو جاتے۔ لُون پانی...... دوا دارو...... دھمال قوالی...... اس چوکھٹ پہ جو بھی خالی ہاتھ آتا...... جھولی بھر کے لے جاتا...... میں بخشے بھر کے سارے بوجھ اُتار کے ہاکا پھاکا ہو جاتا۔ سب دُکھوں محرومیوں اور اکیلے پن کا احساس میری آنکھوں میں سمٹ آتا۔ واپس یونیورسٹی آ کر اسی دیوارِ گریہ کے ساتھ لپٹ کے رو دیتا جہاں عائشہ مجھے ایک سال پہلے اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ وقت کا سورج روز مجھے اس دیوار سے چپکا تک کر سوگوار دیکھتا تو دیوار کے اس پار اُتر جاتا...... وقت تو صرف میری کتابوں کے صفحے اُلٹتا رہا پھر امتحان شروع ہوئے مگر امتحان ختم کب ہوئے تھے۔ سلطان کے دربار حاضر ہوا، آخری سلام کر کے اس شہرِ نارسا کو چھوڑ دیا...... گاؤں واپس اپنی کُھرلی میں آ گیا۔ وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسے چھوڑ کر گیا تھا۔ گاؤں کی گلیاں، کھیت کھلیان...... میاں جی کا حجرہ جو شاید اندر سے بند تھا، لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک طویل مراقبے میں ہیں...... دریا کے کنارے میرا خوبصورت

سا گاؤں...... مگر میری آنکھوں میں صرف ایک ہی منظر بس گیا تھا۔ باقی سارے منظر آنسوؤں میں ڈھل گئے تھے۔ میں تو ایک سفید چھتری لے کر گاؤں آیا تھا۔ یہاں آکر کیا دیکھتا، کس کو دیکھتا۔ سارا سفر ہی رائیگاں گیا تھا۔ کچھ کتابیں تھیں...... کچھ یادیں تھیں...... یہ حرف میں نے سیکڑوں بار پڑھے تھے اور یہ تصویر جس دل کے آئینے میں اُتری تھی، وہ شیشہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ یونیورسٹی ڈگری لینے گیا تھا...... دہکتے انگارے کاغذوں میں لپیٹ لایا...... میں تھا...... گاؤں کے دھول بھرے راستے تھے...... سارے منظر اندھیر ہو چکے تھے...... کبھی کبھی دریا کنارے چلا جاتا...... اور سوچ دریا میں گھنٹوں غوطے کھاتا رہتا...... ایک آسیب تھا جو کسی لمحے مجھے چین نہ لینے دیتا۔ جوں ہی مجھے تنہا دیکھتا دبوچ لیتا۔ سوچا میاں جی کے حجرے جاؤں اور جھاسے ڈر جانے والے بچے کی طرح ان کی پیٹھ کے پیچھے چھپ جاؤں، مگر وہ بھی تو اس مادی دُنیا کے کسی آسیب سے ڈر کر حجرے کی مٹی کھود کر چھپ گئے تھے...... اوپر ایک سبز چادر اوڑھ لی تھی۔ وہاں تو دیئے جل رہے تھے...... اگربتیاں سلگ رہی تھیں...... میں بھی کیسا پاگل تھا، آگ سے آگ بجھانے چلا تھا۔ سنا ہے کہ وقت اگر تمہاری گرفت میں آ جائے تو تیتر کی طرح اُسے پنجرے میں بند کر لو وہ باجرے کی طرح دانہ دانہ کر کے تمہارے دُکھ چُن لے گا اور اگر تم اُس کی گرفت میں آ گئے تو تمھیں خود ہی اپنے دُکھ چننے ہوں گے۔ دل کی جیبوں سے نکال کر انگارے آنسوؤں سے بجھانے ہوں گے۔ میں بھی کس خود اذیتی کا شکار ہوں یہ کیوں نہیں جان لیتا کہ جس کے دُکھ کے بوجھ سے میں ٹوٹ رہا ہوں، وہ اپنے گھر کے کسی گرم کمرے میں اپنے ساتھی کے پہلو میں بیٹھی اُون سلائی سے چھوٹے چھوٹے موزے اور بڑے بڑے خواب بن رہی ہوگی...... اور میں زندگی کی ادھوری بنت کو اپنے ہی ہاتھوں سے اُدھیڑ رہا ہوں...... نیلی ڈائری کی اگلی تاریخوں پر اس نے مستقبل کی خوبصورت تصویریں چسپاں کر لی ہوں گی جب کہ میں نے گزر جانے والی تاریخوں کے کالے حرفوں سے لکھے کاغذ مقدس صحیفوں کی طرح سنبھال رکھے ہیں۔ میں یادوں کی کرچیاں دل کی جیبوں سے نکال کیوں نہیں دیتا۔ جب تک دل دھڑکتا رہے گا۔ یہ چبھتی رہیں گی اور بے چین رکھیں گی......

کسی کسی رات جب میری نیند مجھ سے رُوٹھ جاتی ہے تو اس کو بہلانے کے لیے ایک ورد کرتا ہوں ...... مجھے نیند آ رہی ہے ...... اب میری آنکھیں بوجھل ہو گئی ہیں۔ اب میں بالکل سو گیا ہوں ...... اور یوں میں آہستہ آہستہ نیند کی گود میں سمٹ جاتا ہوں۔ اس کو بھولنے کے لیے میں نے ایسا ہی ایک ورد شروع کیا۔

میں اُس کو بھول جانا چاہتا ہوں ...... میں اُس کو بھول رہا ہوں ...... میں اس کو بھول گیا ہوں ...... وہ مجھے بالکل یاد نہیں آتی ...... جب میں اس کو یاد کر کے بھولنے کی احمقانہ کوشش کرتا ہوں تو یہ عمل اُلٹا ہو جاتا ہے ...... بے بسی، محرومی، تنہائی اور دُکھ کی راکھ مجھ پر آن گرتی ہے ...... وہ راکھ میں نے چہرے پہ مل لی۔ میاں جی کے اُجاڑ مدرسے سے نکلا، شہر کے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے میں مجھے اپنے سبجیکٹ میں ہی معقول ملازمت مل گئی ...... بہت صاف ستھرا اور disciplined ماحول تھا۔ گاؤں کے راستے کی دھول گاؤں ہی میں رہ گئی ...... اندر کا اندھیرا اندر ہی رہا ...... باہر ایک روشنی تھی ...... میں نے اندر جانا چھوڑ دیا۔ مگر کبھی کبھی اندر سے اتنی زور کی دستک ہوتی کہ میں گھبرا جاتا ...... دارو کے کچھ گھونٹ پی لیتا اور سرمئی دھوئیں والا سگریٹ سلگا لیتا، پہروں سلگتا رہتا اور بجھ سا جاتا ...... کوشش کر کے میں مصروفیت کے حصار میں رہتا۔ سارا دن اپنے شاگردوں کو پڑھاتا، شام کو گراؤنڈ میں ہاکی کھیلنے چلا جاتا۔ اور رات ہاسٹل میں بچوں کے ساتھ مصروف ہو جاتا۔ جب سب کمروں کی بتیاں گُل ہو جاتیں تب میرے اندر ایک روشنی جل جاتی اور مجھے دیر تک جگائے رکھتی۔ پھر میں ورد کر کے سو جاتا۔ کبھی کبھی اندر کی بے چینی لفظوں، فقروں، مصرعوں اور شعروں کی پُھلجھڑی بن جاتیں۔ شعلوں کی شاخوں پر پھول کھل اُٹھتے، ایک خوشبو کاغذوں پر پھیل جاتی۔ صراحی سے انڈیل کر کلیاں میں خوبصورت جام میں بھرتا رہا۔ ایک طویل وقت کے لیے وجود کے اندر کھلنے والی کھڑکی اور باہر کھلنے والا دروازہ میں نے بند کر لیا تھا ...... کولھو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ دن رات کے دائرے میں مسلسل چلتا رہا۔ شاید میں اس دُنیا سے برسوں دُور نکل آیا تھا، جہاں جینا بھی مشکل تھا اور مرنے کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ پھر کسی نے

دستک دی...... آنکھوں سے پٹی اُتاری...... اندر کی کھڑکی کھولی، اندر تو وہی کڑوا کسیلا دھواں بھرا تھا۔ باہر کا دروازہ کھولا، ایک وجود کھڑا تھا، جس کا طویل سایہ دُور میرے ماضی تک پھیلا ہوا تھا۔ کچھ ٹیچرز کے انٹرویو تھے۔ میرے سامنے ان کی میرٹ لسٹ پڑی تھی۔

''تمہارا نام؟''

''عائشہ''

''مکمل نام؟''

''اگر کوئی خود ادھورا ہو تو اس کا نام مکمل کیسے ہو سکتا ہے۔''

''بی بی! میں سمجھا نہیں!''

''سر! جب پہلے مجھے پورے نام کی ضرورت پڑی باپ مر گیا...... اور پھر جب کسی کا نام میرے نام کے ساتھ جوڑ کر اسے مکمل کیا گیا تو کچھ عرصے کے بعد وہ بھی......'' اس نے دہکتے انگاروں کی انگیٹھی میرے اُوپر انڈیل دی۔

''اوہ، سوری! مگر کیسے؟''

گاڑی کی ٹکر سے غفار ایسا ٹوٹا کہ وہ میرے وجود اور میرے نام سے بالکل علیحدہ ہو گیا۔ اور میں صرف عائشہ رہ گئی۔ سَر بولنے میں کتنی بے گانگی تھی۔ میں نے فوراً اندھے شیشوں والی عینک لگالی۔

''سر آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

''بالکل نہیں! آپ شاید بھول رہی ہیں۔''

''آپ نے ماسٹرز مکمل کیوں نہیں کیا؟''

''کسی نے میرا راستہ کاٹ دیا تھا اور خود مجھے آدھی راہ میں چھوڑ گیا۔۔۔ سر میں نے بی ایڈ کر لیا ہے۔''

''کوئی ٹیچنگ کا تجربہ ہے؟''

''سوری سر!''

''پھر تو مشکل ہو جائے گی...... بہر حال میں کوشش کروں گا۔ اگر تمھیں یہ جاب مل گیا تو کیا تم ہاسٹل میں رہنا چاہو گی یا......''

''نہیں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں...... میری ایک بچی بھی ہے۔''

یہ سن کر میں بُری طرح لڑکھڑانے لگا...... میں تو پُل صراط پر کھڑا بڑی مشکل سے اپنے آپ کو متوازن کیے ہوئے تھا۔

تم جا سکتی ہو! تم کو اطلاع دے دی جائے گی۔

اس اچانک اتفاق نے مجھے گرفت میں لے لیا اور پھانسی گھاٹ پہ لا کھڑا کیا......

اُس روز میں ماں کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پہلے تو میں اپنے اندر رویا کرتا تھا۔ اب کے بند جو ٹوٹے تو میرے دُکھ کے دریا میں میری ماں بھی ڈوبنے لگی...... وہ بے آواز سسکیوں سے رو بھی رہی تھی اور مجھے سنبھال بھی رہی تھی۔

''اگر اُس کی بیٹی بھی ہے تو کیا ہوا، دونوں بیٹیاں لے آئیں گے...... تم اپنی لے آنا اور میں اپنی لے آؤں گی...... دستک تو دیتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ دروازہ کھل جائے گا۔''

یہ سوچ کر کہ نارسائی کا عذاب تو ہم جھیل ہی رہے ہیں، اس اندھیرے میں اگر کوئی نئی راہ نکل آئی تو وہ روشنی ہی کی سمت جائے گی...... اُس کے گھر میں ماں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ عجیب کشمکش میں تھی...... کتابِ زندگی کے پچھلے ورق ڈھونڈ ڈالے...... بڑے کمزور حوالے تھے...... یونیورسٹی میں داخلہ لینا...... عائشہ کے ساتھ لائبریری کی میز پر بیٹھ کر نوٹس تیار کرنا...... کیمپس کے لان میں بیٹھ کر اقبال، غالب اور ذوق کو ڈسکس کرنا...... چھٹیوں میں اس کا مجھے طویل خط لکھنا جن کا میں آج تک جواب نہ دے سکا اور ایک روز اُس کا یونیورسٹی چھوڑ کر چلے جانا۔

عائشہ! یہ میری ماں ہے اور میرا یہی سب کچھ ہے۔

شان میرا بھی ماں کے علاوہ کوئی نہیں......

پھر چپ کی گفتگو کا ایسا سلسلہ چلا جو بیالی میں چمچ کی آواز پر ٹوٹا ...... میری ماں
جائے نماز پر بیٹھ کر اپنی جس بڑی سی چادر کا دامن اپنے رب کے سامنے پھیلایا کرتی، اس
چادر میں میرے سارے دکھ سمیٹ کر اسے عائشہ کی ماں کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس
کے زخموں پہ ایک اور چوٹ جو پڑی تو وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی ...... دروازہ بغیر چابی
کے ہی کھل گیا ... اگلے مرحلے میرے لیے اجنبی مگر بڑے آسان تھے۔ ٹرین سٹیشن سے
نکل پڑے تو آگے راستے اور سمت کا تعین خود بخود ہو جاتا ہے ...... ہمارے کمرے کی انگیٹھی
کی کارنس پہ رکھی ایک تصویر جس میں دور تک دھند میں لپٹا ایک راستہ تھا ...... اور دو سائے
ایک بچی کی دائیں اور بائیں ہاتھ کی انگلی تھامے چل رہے تھے ...... وہ خواب راستہ ایک سال
میں یوں طے ہوا جیسے کسی نئے جوڑے کی پہلی رات باتوں میں گزر جاتی ہے ...... دھند چھٹی
تو دیکھا کہ کناروں سے باہر چھلکتا دریا اتر چکا تھا ...... اس کنارے میں تنہا کھڑا تھا۔ اور اُس
کنارے عائشہ اپنی بچی کی انگلی تھامے ایک پچھتاوا اوڑھے اُداس کھڑی تھی ...... اور پانی کی
ایک لکیر دونوں کے درمیان دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔

□□□

تخلیق کا تعاقب

سنسنی خیز خبروں والے پھٹے اخباروں کے پیچھے نچپی اور باسی پتیوں کے وجود سے نچوڑی جانے والی چائے کی طرح خیالی سی میری زندگی ...... جس کے اونگھتے ہوئے وجود کو میں نے پچھلے دس برسوں میں ہوٹل کی گنی گنائی بیس سیڑھیوں پر مسلسل گھسیٹا ہے۔ کتنے طویل وقت میں میں نے زندگی کے کتنے مختصر راستے طے کیے ہیں...... یکسانیت کی تھکن اور جمود کا بوجھل بوجھل احساس...... سچ تو یہ ہے کہ اب صرف بیس سیڑھیوں پر ہی میں بُری طرح ہانپ جاتا ہوں...... ریلنگ کا سہارا لے کر دوسری منزل سے نیچے جھانکتا ہوں تو سڑک پہ مجھے انسانوں کا بہتا ہوا ایک دریا نظر آتا ہے۔ کئی بار سوچتا ہوں کہ اس دریا میں کود پڑوں...... ان بہتے پانیوں میں ڈوب جاؤں...... معجزانہ طور پر بچ بھی نکلوں تو دوسرے کنارے سے موسیٰ کی طرح کسی قوم کو ساتھ لے چلوں اور اگر میری لاش ان لہروں پر تیرنے لگے تو فرعون کی طرح میرے وجود کو محفوظ کر کے شیشے کے شوکیسوں میں سجا دیا جائے۔

اکثر میری منتشر سوچیں جلتی رہتی ہیں...... آخری سیڑھی پر میں جلی سوچوں کی راکھ جھاڑ کر ہوٹل کے کونے والے کیبن میں کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا ہوں...... کھڑکی کے پردے کھینچ دیتا ہوں تو ہوٹل کے بند، گھٹے گھٹے ماحول میں عجیب سی تسکین ملتی ہے۔ مانوس سے در و دیوار...... برسوں پرانی میلی کچیلی کرسیاں...... دیواروں پہ آویزاں دھندلے آئینے جن میں بگڑی صورتیں ہر آنے والے کو گھورتی ہیں...... کیبن کی دیواروں پہ لکھے میسیوں

نام...... جو اکثر گاہک جاتے ہوئے دیواروں پہ نقش کر جاتے ہیں۔ شہر کے اس مصروف ترین بازار کے اس ہوٹل میں میں نے بہت کم تبدیلیاں دیکھی ہیں البتہ ہر رمضان میں دیواروں پر رنگ پھیر دیا جاتا ہے اور میزوں کی پلاسٹک کی شیٹیں تبدیل کر دی جاتی ہیں۔

عبدل کے بقول...... میں اس ہوٹل کا سب سے پرانا اور مستقل گاہک تھا۔ عنایتا اور عبدل بہت پہلے سے اس ہوٹل کے ملازم تھے۔ میں نے اپنی پکی ملازمت کی پانچ، پانچ روپے کی دس انکریمنٹس لی تھیں۔ اس دوران سرجو جو ہوٹل کی سیڑھیوں کے قدموں میں بیٹھ کر کباب بنایا کرتا تھا...... لکڑی کے تختے سے اٹھ کر ہوٹل کے کاؤنٹر تک جا پہنچا۔ سراج بابو کے ہوٹل خرید لینے سے کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی ماسوا اس کے کہ خانسامے کو ہوٹل سے باہر کر دیا گیا۔ عنایتے نے باورچی خانے کو سنبھال لیا اور ایک نیا بیرا بھرتی کر لیا گیا...... یہی تبدیلی اس کہانی کا اصل محرک ہے۔

عنایتا اُس روز نئے بیرے کو میرے پاس لایا۔

''یہ بابو ہمارے ہوٹل کے سب سے پرانے گاہک ہیں...... ان کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔''

جانے وہ بیرا میری اہمیت سمجھا، یا نہیں مگر اس نے اپنے دانت ضرور نکال دیے۔

اور میں...... اپنی اس جمود بھری زندگی کے سنگلاخ سینے پر جھکڑوں کی طرح اُگی ڈھیر ساری نفرتوں کو اس بیرے پر اُنڈیل دینا چاہتا تھا۔ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے یہ میری ایک ضرورت بھی تھی۔ اَن گنت الماریوں کی طویل قطار کے آخری کونے والی واحد کھڑکی کے نیم تاریک دفتر میں میں نے اکثر بے بسی کے نیم پختہ احساس کے ساتھ ساتھ اس ضرورت کو بھی شدت سے محسوس کیا ہے۔

''کاش بڑا صاحب چپڑاسی کو تھوڑے وقت کے لیے فارغ کر دے۔ وہ میری کلرکی کی میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھ جائے۔ ضابطوں کے اندر رہ کر میں اُسے کچھ حکم دوں اور کچھ نفرتوں کا اظہار کروں اور یوں ہم جنس پر برتری والی فطری جبلت کو کچھ تو تسکین ملے۔

مگر اس ننھے بیرے نے مجھے کوئی موقع نہ دیا۔

میز پہ بکھرے روٹی کے ٹکڑے ...... پانی کے قطرے ...... سگریٹ کا خالی پیکٹ،
اس نے صافی سے سمیٹ کر خالی پلیٹ میں ڈال لیے۔ پانی کا تروتکا دے کر میز پر صافی جو
پھیری تو پلاسٹک کی میلی شیٹیں بالکل گلابی نکل آئیں۔ پل بھر کو وہ غائب ہو گیا اور فوراً سے
پہلے حاضر ہوا۔ میز پر اس نے صاف ستھرے دو گلاس اور ٹھنڈے پانی کا بھرا جگ سجا دیا۔

"صاحب! آپ کھانا کھائیں گے یا چائے نوش فرمائیں گے۔"

"ابھی کچھ نہیں چاہیے ...... پہلے اخبار لاؤ ...... مگر فرنٹ پیج لانا۔

"وہ میری انگریزی سے بالکل نہ چونکا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ اردو اور انگریزی اخباروں
کے دو چار صفحے اٹھا لایا اور جاتے جاتے کیبن کا پردہ کھینچ گیا۔ اس کی یہی بات مجھے سب
سے زیادہ پسند آئی۔ اس کے بعد اُس نے ہمیشہ میری پسند کا خیال رکھا۔ کھانے میں پیاز
کے ساتھ ٹماٹر، نمک کے ساتھ کالی مرچ اور برتنوں کے ساتھ ایکسٹرا پلیٹ لانا کبھی نہ بھولا۔
وہ ایک منٹ کا کہہ کر ہمیشہ آدھا منٹ صرف کرتا۔ تنور سے تازہ تازہ گرم روٹیاں لاتا ......
سپیشل چائے بنواتا ...... وہ یہاں تک خیال رکھتا کہ کبھی بھول کر بھی چائے کے برتنوں میں
Stainer نہ آ جائے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے Stainer سے شدید نفرت ہے۔ اس
بیرے نے ہفتہ بھر میں میری نفرتوں، منفی سوچوں اور بابو پن کی وہ ساری دیواریں گرا دی تھیں
جن پر کھڑا ہو کر میں اس بیرے کو اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

پھر میں نے اُس سے دوستی کر لی ...... ایک ضرورت کی حد تک۔

اُس روز ہوٹل تقریباً خالی تھا اور وہ بڑے انہماک سے کرسی کا سہارا لیے انگریزی
اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی ...... ممکن ہے وہ اخبار میں تصویریں دیکھ رہا
ہو ...... مگر وہ تو Editorial page تھا جس پر کوئی تصویر نہ تھی۔ میں نے اخبار اُس کے
ہاتھ سے لے لیا۔ اُسے چائے کا کہہ کر کیبن میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ اخبار میں کیا دیکھ
رہا تھا۔ جیسے میں کھڑکی سے نیچے سڑک پہ جھانکتا ہوں ایسے ہی ممکن ہے وہ بیرا کہیں آج کے

اخبار کے دریچوں سے کل کے سینے پہ بچھی سڑکوں کے کنارے اپنے قدموں کے نشان تو نہیں دیکھ رہا۔

آدمی اکیلا ہو اور اس کا شعور اخبار کے حرفوں کو نہ پہچان سکے تو یہ نقطے سمت کر جانی پہچانی تصویروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ ممکن ہے اُس کو Editorial page پر گندے نالے کے کنارے کھمب کی طرح اُگی وہ جھونپڑیاں نظر آئی ہوں جہاں اس نے جنم لیا ہو...... اُسے اپنے میلے کچیلے ساتھی نظر آئے ہوں جن کے جلے جسموں پر ابتدا ہی سے زنگ لگ جاتا ہے...... جن کے پیلے چہروں کی مایوس مسکراہٹوں سے بھوک جھانکتی ہے...... جن کے بچپنے کی راہیں ان گلیوں سے نکل کر ہوٹلوں کے دھوئیں میں گم ہو جاتی ہیں...... جن کا وجود ہوٹل کے باورچی خانے کے گرم، اُبلتے ماحول میں جل بھن کر گوشت کی طرح پک جاتا ہے...... جسے کوئی بھی چبا سکتا ہے...... جن کا احساس خودی چائے میں چینی کی طرح تحلیل ہو جاتا ہے...... مستقبل ٹب میں کھنکتی پیالیوں کے دھونے میں بہہ جاتا ہے...... ا، ب، ج کی آواز ABC تک پہنچنے سے پہلے ہوٹلوں کی ریکارڈنگ میں گم ہو کر دم توڑ دیتی ہے۔

پھر وہ ABC والا اخبار کیوں دیکھ رہا تھا!

جب میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو دوسروں کے لیے سوچیں ہوتی ہیں۔ کچھ مسائل جو دوسروں کے ہوتے ہیں۔ میری اپنی جو دو بھری زندگی کے مسائل بہت کم اور Cheap قسم کے ہیں۔ میری غیر ازدواجی زندگی...... کبھی میں خاوند بن کر عجیب عجیب باتیں سوچتا ہوں...... کبھی باپ بن کر سوچتا ہوں...... ان سوچوں کی بیساکھیوں کے سہارے اپنی اس کنواری زندگی کو کئی سالوں سے گھسیٹ رہا ہوں۔ میرے محدود سے معاشی مسائل...... اس پکی نوکری میں سال کے سال تنخواہ میں گھڑیال کے ٹن کی طرح عین اپنے وقت پر پانچ روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

وہ بیرا چائے کے برتنوں میں آج Stainer جو لایا تو میرے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا اور میری سوچیں اُلجھن کر رہ گئیں۔

"تم Stainer کیوں لائے ہو......؟"

"بابو! Stainer اچھی چیز ہے۔ آپ اسے ضرور استعمال کیا کریں۔ آپ Check سے کیوں ڈرتے ہیں۔ برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ یہ Stainer آپ کی نفسیاتی الرجی ہے۔ بابو! زندگی ایک مسلسل تجربہ ہے اور تجربوں کے لیے Check بہت ضروری ہوتا ہے۔ آج کے Times میں Human Crisis کا آرٹیکل ضرور پڑھیں۔ بڑا جامع مضمون ہے۔ Author نے انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے نفسیاتی پہلوؤں کا خوب صورتی سے تجزیہ کیا ہے۔

"Please don't miss to read it"

اُس بیرے نے مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

کہیں اُس نے میرے بابو پن کے غلاف میں لپٹے اُس بزدل شخص کو تو نہیں دیکھ لیا جو دنیا بھر کے ناول اور افسانے پڑھنے کے بعد ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے غلام نبی ہنواڑی کی طرح سوچا کرتا ہے۔

وہ بیرا مجھے مینار کی طرح نظر آیا اور میں اُس کی سیڑھیاں گننے لگا۔

"تم اتنے پڑھے لکھے اور باشعور ہو کر بیرا گیری کرتے ہو ... تم تو مجھے کوئی Genius لگتے ہو۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"بابو! اس وقت میرا نام ایک بیرا ہے۔ میں بازار کے اس کاروباری ہوٹل کی ایک جنس ہوں۔ اس commercial age میں ہر چیز Packing میں ملتی ہے۔ ایسے ہی میرے بھی کئی خول ہیں۔ ہر خول کا Label الگ ہے۔ میں دھرتی کے ستائے ہوئے انسانوں کا بہروپ ہوں ... میں اُن کے سانچوں میں ڈھل جاتا ہوں ... اُن کے دکھ اپنا لیتا ہوں ... اور اُن کے راستوں پر چل کر ... اُن کے نصیبوں میں لکھی نفرتوں کے انبار اپنے کاندھوں پر اٹھائے، ان کی قبروں تک ان کے بوجھ لیے چلتا ہوں اور جب میرے اصل وجود کا احساس مر جاتا ہے تو کسی تھکی ہوئی شام ... وہ خول اتار پھینکتا ہوں۔ ان

راستوں کی سمیٹی گرد، دکھ، زخم، رستے ہوئے ناسور...... کاغذوں پر انڈیل دیتا ہوں...... تو
لوگ مجھے افسانہ نگار کہتے ہیں...... شیراز طاہر میرا نام ہے......"
"شیراز...... طا...... ہر! ملک کا عظیم افسانہ نگار......!"
کیبن کی دیواروں پہ لکھے سیکڑوں نام میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے...... ہر
نام مجھے شیراز طاہر نظر آیا...... پنکھے کے نیچے Stainer سے چھنی چائے کا قہوہ بالکل سرد ہو
گیا۔ میں نے بغیر دودھ چینی کے وہ سرد، سیاہ اور تلخ قہوہ حلق میں انڈیل لیا......
"اور بابو ان مرحلوں، ان تجربوں، دکھوں، نفرتوں سے گزر کر ایک کہانی لکھنا
چاہتا ہوں جس سے ایک بیرا گزر رہا ہے۔"
ٹرے میں خالی برتن یوں چھنک اُٹھے جیسے وہ بیرا نہیں...... واقعی افسانہ نگار تھا
اس نے میز کو یوں ہی سا صاف کیا...... بغیر پردہ کھینچے، برتن اُٹھائے، بوجھل قدموں سے
باورچی خانے چلا گیا...... چہرے پہ ایک کرب لیے...... جیسے اس کے زخم مسکرا پڑے ہوں......
شاید میں نے اُس کی کھال اتار لی تھی......"
"جھوٹ ہے...... بکواس ہے...... ایسا نہیں ہو سکتا......"
اگلی صبح شیراز طاہر مجھے ہوٹل کی سیڑھیوں کے قدموں میں کبابوں والے تختے پر
بیٹھا ملا۔
"بابو! جانے سے پہلے میں نے سوچا...... کہ آپ سے ملتا جاؤں۔ اب میرا خول
اُتر چکا ہے۔ بیرے کی حیثیت سے کام کرنا مشکل ہو گیا ہے...... آپ ایک وعدہ کریں......
شیراز طاہر جس روپ میں آپ سے ملا ہے اور جن مرحلوں سے گزر کر وہ کہانیاں لکھتا ہے......
آپ کسی سے اُن کا ذکر نہیں کریں گے...... ممکن ہے کہ زندگی کے کسی اور روپ میں آپ
سے ملوں...... آپ خدا کے لیے انجان بن کے گزر جانا...... اسی میں ایک فن کار کے فن کی بقا
ہے...... خدا حافظ"
شیراز چلا گیا...... اور میں یہ سوچتے ہوئے سیڑھیاں عبور کرنے لگا کہ اتنی عمر کے

گزرے سالوں میں میں اپنے اوپر سے بابو پن کے خول کو بھی نہ اُتار سکا...... جب کہ شیراز طاہر نہ جانے کتنے ہی روپ بدل چکا ہے۔ کیبن کی کھڑکی کا پردہ کھینچنے سے پہلے میں نے باہر سڑک پر دیکھا۔ شیراز انسانوں کے بہتے دریا میں غرق ہو چکا تھا۔ میں نے کیبن کی دیوار پر شیراز طاہر کا نام کندہ کر دیا۔ اور پھر میں نے اپنے آپ کو کھود ڈالا...... اپنے وجود کے اندر اپنی ذات کے علاوہ مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ یہ بھی کیا زندگی ہے کہ تم اپنے لیے خود ہی قبریں کھودتے رہو۔ جب موت آجائے تو خاموشی سے ان قبروں میں اُتر جاؤ۔ تم دوسروں کے لیے تاج محل کا وجود کیوں نہیں تراشتے تاکہ جب وہ مکمل ہو جائے تو تمہارے ہاتھ کاٹ دیے جائیں اور تمہارا فن امر ہو جائے......"

شیراز طاہر ہی کو دیکھو...... اخبار کے تراشوں کی طرح اس نے لوگوں کے دکھوں کو اپنی زندگی کی فائل میں پرو رکھا ہے...... اور میں...... میں نے دفتر کی فائلوں پر بھی اپنا نام لکھا ہوا ہے۔ وقت کی گرد کتنے حادثوں اور کتنی یادوں کو ڈھانپ دیتی ہے۔ گاؤں کے گدلے پانی کے جوہڑ کی طرح...... میری زندگی کی یادیں اور حادثے بچے کے پھینکے ہوئے پتھر کی طرح پانی میں گم ہو جاتے ہیں...... جس میں ذرا سے ارتعاش کے بعد کائی کی سبز چادریں پُرسکون ہو جاتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میری زندگی کا المیہ بھی یہی ہے کہ میری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ میرے خیال میں وہ میرا دکھ اس کرتا تھا۔ وہ شیراز طاہر نہیں ہو سکتا مگر اگلے ماہ ایک ادبی شمارے میں میں نے شیراز طاہر کا افسانہ پڑھا۔ اُس نے میرے ہی زندگی کے سارے دکھوں، اس کے احساسات، جذبات اور نفرتوں کے سمندر کو اس کہانی کے سانچے میں ڈھالا تھا اور اس کہانی میں میرا بھی نمایاں ذکر تھا۔

میں نے سوچا کہ میں بھی شیراز طاہر کی طرح کیوں نہ افسانے لکھنے شروع کر دوں۔ میں جب ایسی باتیں سوچ سکتا ہوں محسوس کر سکتا ہوں تو لکھ کیوں نہیں سکتا۔ اسی کی طرح میں لوگوں کے دکھوں کو اپناؤں گا...... اپنے وجود کو مٹا ڈالوں گا۔ سادہ ورقوں کی طرح اپنی

زندگی کے کورے کاغذوں پر لوگوں کے دکھوں کی کہانیاں لکھوں گا...... مگر فن کی تکمیل کے لیے حادثے بہت ضروری ہوتے ہیں۔

ہوٹل کے کیبن کی کھڑکی سے اکثر میں ایک کتے کے بچے کو دیکھا کرتا تھا جو ہر گزرنے والے راہ گیر کے پیچھے ہو لیتا۔ تھوڑی دور جا کر واپس آ جاتا اور پھر کسی نئے راہ گیر کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک کڑکتی دوپہر کو وہ ایک راہ گیر کے پیچھے چلتے چلتے فٹ پاتھ سے سڑک پر پہنچ گیا تو ایک حادثہ ہُوا...... میں نے بس کے ٹائروں پر خون کے سرخ دھبے دیکھے۔ صفائی کرنے والی لڑکی کو سڑک سے گوشت کا ایک لوتھڑا اٹھاتے ہوئے دیکھا اور......

شیراز طاہر خاردار تار کی بلند دیواروں کے اس پار ایک عظیم مینار کی طرح کھڑا ہے جس کی بلندیوں کو چھونے کا مَیں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری سوچ اور میرے حوصلے ابھی اُس کتے کے بچے کی طرح کم سن ہیں جو فٹ پاتھ سے سڑک پر پہنچتا ہے تو حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کہ میری دفتری زندگی میں اتنی گنجائش بھی نہیں کہ میں اپنی کلرکی کی میز ایک کونے سے دوسرے کونے میں لے جا سکوں۔

اس کے بعد میں نے شیراز طاہر کی بہت سی کہانیاں پڑھیں۔

جیٹھ ہاڑ کی چلچلاتی دھوپ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی کہانیاں...... جو ملیشیے کی نیکر پہنے، ربڑ کے ٹکڑے، سلوشن کا ڈبہ اور قینچی لیے...... سائیکلوں کی ٹیوب کے ساتھ ساتھ اپنی دریدہ زندگی پہ پنکچر لگاتے پھرتے ہیں۔

شیراز طاہر کا دکھ کتنا ہمہ گیر تھا۔ اس کی کہانیوں میں مَیں نے برف پوش پہاڑوں کی محنت کش بیٹیوں کے لوک گیت سنے؛ تارکول کی جلی سڑکوں کے کنارے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھی بوسیدہ غراروں میں ملبوس جھاڑو والی حاملہ عورتوں کی کہانیاں لکھتے ہوئے شیراز طاہر کتنی سادگی سے لکھتا ہے

''وہ ہر تین سال میں باقاعدگی سے چار بچوں کو جنم دیتی ہیں مگر پھر بھی اُن کے پیٹ اور اُن کی ٹوکریاں غلاظتوں سے خالی نہیں رہتیں۔''

پہاڑی ریلوے سٹیشن پر کوئلے چننے والی دوشیزہ 'سرگولے' کی کہانی لکھتے ہوئے شیراز طاہر کہتا ہے:

''اس کی زندگی دسمبر کی سرد طویل راتوں کی طرح اداس ہے۔رات کے پچھلے پہر مسافر خانے کی کھڑکی سے نظر آنے والی سگنل کی سرخ روشنی کی طرح تنہا ہے۔اس کے دکھ گیلی تاریک راتوں کی طرح گمبیھر ہیں...... اُس کی ماں قبروں کی تلاش میں رہتی ہے۔جب کہ اُس کے باپ کو کچھ نظر نہیں آتا۔اس پہاڑی ریلوے سٹیشن پر وہ سارا دن لکڑیاں اور کوئلے چنتی رہتی ہے۔جب شام کو سرد ہوا چلتی ہے...... گھر لوٹنے والا گڈریا کوئی الیہ گیت چھیڑ دیتا ہے...... پہاڑوں کے مہیب سائے وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں...... واٹر ورکس کی چمنی کا دُھواں بھی نظر نہیں آتا اور گُلّو ڈھیر ساری لال بتیاں اُٹھائے لائن کے ساتھ دُور دُور تک سگنل روشن کر دیتا ہے۔اس وقت پچھم سے ایک گاڑی آتی ہے۔چند لمحوں کے لیے ٹھہرتی ہے اور سرگولے روز اس گاڑی سے اپنے شہر چلی جاتی ہے۔

مگر...... اس سرد طوفانی شام کو گاڑی بھی نہ آئی۔اور گڈریے نے کوئی الیہ گیت بھی نہ چھیڑا۔گُلّو بتیاں جلا کر اور لائن کلیئر سٹینڈ میں اڑا کر کمبل اُٹھائے اپنے کوارٹر چلا گیا۔مسافر خانے میں سرگولے اور دفتر میں لطیف بابو تنہا رہ گئے۔سرد طوفانی ہواؤں نے سرگولے کو مسافر خانے سے دفتر میں دھکیل دیا۔اُس رات دفتر میں انگیٹھی سرد رہی۔سرگولے ساری رات کوئلوں کی طرح دہکتی رہی اور جل جل کر راکھ ہوگئی۔صبح تک سرخ بتیاں بھی روشن رہیں اور لائن بھی کلیئر رہی۔

دُکھوں کے انبار لیے زندگی اتنی آسانی سے نہیں گزر سکتی جتنی آسانی سے لوگ کہتے ہیں کہ وقت گزر جاتا ہے۔انہی راستوں پر میں نے ایک بار شیراز طاہر کو سڑک کے کنارے چھابڑی لگائے دیکھا۔اس سڑک کے کنارے انسان کی زندگی کتنے بھیانک انداز میں بکھری پڑی تھی۔اس میں الجھاؤ بھی تھا اور سلجھاؤ بھی۔سلجھاؤ صرف اتنا جتنا شیراز طاہر نے اپنی چھابڑی پہ سجا رکھا تھا۔

شیراز طاہر ایک نوجوان بھکارن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لوگ اسے بھیک دے کر اس سے کچھ مانگتے ہیں مگر کسی کے بھیک دینے یا لینے سے بھوک ختم نہیں ہو جاتی۔

میں نے ایک بار اسے پُل کے اس پار بھی دیکھا۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ تجربے اپنی جگہ ٹھیک، مگر مجھے یوں اس کا گٹر میں اترنا بہت برا لگا۔ میں نے اُسے نیم تاریک سایوں میں بڑے مشکوک انداز میں عجیب سے لوگوں سے کھسر پھسر کرتے دیکھا۔ ممکن ہے شیراز طاہر یہ دیکھنے گیا ہو کہ اس بازار کی بالائی منزلیں اتنی روشن کیوں ہوتی ہیں جب کہ فرشی منزلوں پہ اندھیرا ہوتا ہے۔ یا نیم مریل چہرے والے بلب یا دروازوں سے لٹکی پیلی روشنی والی لالٹین جن سے سودا بھی صاف نظر نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے شیراز طاہر لکھے گا کہ جس دوکان میں جتنے زیادہ واٹ کا بلب جلتا ہے اُس بھٹی میں اتنا ہی کوئلہ جھونکنا پڑتا ہے...... یا وہ یہ محسوس کرنے گیا ہو کہ جنس کا سودا کرتے کرتے انسان کتنے عرصے میں خود بک جاتا ہے۔

پھر وہ پُل کے اُس پار سے بھی غائب ہو گیا۔

ایک طویل عرصہ میں اسے ڈھونڈتا رہا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے اسے ادبی رسالوں میں تلاش کیا، کہانیوں کے دریچوں سے جھانک جھانک کر اسے دیکھا، روشن تاریکیوں میں اسے ڈھونڈا، وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ نہ جانے وہ پُل پار سے واپس آیا بھی تھا یا نہیں۔ کہیں وہ اُس بازار کی گلیوں میں تو نہیں بھٹک گیا۔ تلاش میں عرصہ گزر گیا۔ پھر میں نے ایک بیوی ڈھونڈ لی۔ روایتی انداز میں ہم نے ڈھیر سارے بچے پیدا کرنے کا پروگرام بنایا۔ تیسرے بچے کی پیدائش پہ وہ مر گئی۔ شیراز کے دکھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں نے اپنی گٹھڑی بھاری کر لی تھی۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ پھر ایک اداس تھکی ہوئی شام کو شیراز طاہر جو ملا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ تھکا ہوا تھا۔ سارے وعدے توڑ دیے۔ ضابطوں کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ شیراز طاہر مجھ سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

''شیراز! اتنی بے رخی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ تم کہاں کھو گئے تھے۔ تمہارا فن کدھر

گیا۔ کہیں وہ قلم کار...... ! آج کل کیا کر رہے ہو۔ کون سے تجربے سے گزر رہے ہو۔'' میں نے اس سے ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔

''بس میں ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہوں مگر سنو! کیا تم میرے گھر آسکتے ہو؟......
لیاقت روڈ پر سب سے پہلا گھر میرا ہے...... کل شام کی چائے اکٹھی پئیں گے۔''

وہ جلدی میں تھا، سلام کر کے چلا گیا۔ مگر میں بہت خوش تھا کہ وہ ہیرا جو مجھے برسوں پہلے ایک ہوٹل میں ملا تھا اس نے آج مجھے شیراز طاہر کی حیثیت سے اپنے گھر بلایا تھا۔

رات بے چینی سے گزری۔ اور اگلی شام تک کا انتظار تھکا دینے والا تھا۔ وقت سے پہلے میں سول لائن کے سٹاپ پر اترا۔ سامنے ہی لیاقت ایونیو تھی۔ سٹاپ کے پاس ہی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ شاید کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ بس سٹاپ کے پاس ہی ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ قریب ہی اس کی ٹوٹی ہوئی سائیکل اور سامان بکھرا پڑا تھا۔ ٹرک فٹ پاتھ سے ٹکرا گیا تھا۔ مجھے یہ سب دیکھ کر بے حد دکھ ہوا۔ اور میں نے یہ دکھ شیراز طاہر کی طرح محسوس کیا۔ سوچا کہ ابھی گھر سے شیراز طاہر کو پکڑ کر لاتا ہوں کہ اس لاش کو دیکھو جو سر راہ یوں پڑی ہے جیسے کوئی نمائش لگی ہو۔ پتھر دل سڑک بھی اس کے لیے خون کے آنسو رو رہی ہے۔ جب کہ لوگ دلیلوں سے اس حادثے پہ تبصرہ کر رہے ہیں۔ زندگی میں نہ جانے وہ کتنا ذلیل ہوا ہوگا آج مر کر بھی وہ رسوا ہو رہا ہے۔ ابھی اس کی زندگی کے کتنے کام باقی ہوں گے۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں میں نے ایک افسانہ نگار کی طرح سوچیں۔ کاش میں یہ سب کچھ لفظوں میں سوچ سکتا۔ سوچوں کا یہ کرب ناک سلسلہ ٹوٹ گیا۔ پولیس انسپکٹر جیپ سے اترا اور اس نے لاش پہ پڑی بھکاری کی بوسیدہ، دریدہ چادر کھینچ لی۔

میں وہ سب کچھ دیکھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ تو شیراز طاہر تھا!

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں اس پر جھک گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان تھا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے شیراز طاہر ابھی اٹھے گا...... اپنی روشن جبین سے سرخی صاف کرتے

ہوئے کہے گا۔

''دوست! فن کی تکمیل کے لیے حادثے بہت ضروری ہوتے ہیں۔
میں آج اس تجربے سے گزر کر...... اس حادثے سے گزر کر......
......ایک عظیم کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔''

□□□

ضمیر کی لاش

ہو سکتا ہے کہ ماضی کے بند لفافوں میں تمہاری کوئی تصویر پڑی ہو...... تلاش کروں گا...... مانوس سی صورت...... آنکھوں میں اُلجھے سے سوال...... کتاب کی طرح خاموش سا چہرہ جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے...... تم کسی ادھوری کہانی کا الجھا ہوا کردار نظر آتی ہو۔

اُس روز تم Retiring room کے برآمدے میں نظر آئیں تو میں پہروں سوچتا رہا...... کہ اس سے پہلے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے...... حالات کے کسی دُھندلے موڑ پر تم ملی تھیں...... یاد نہیں آ رہا...... ایک نیم تاریک سے احساس میں تمہارا سایہ میں اب بھی دیکھ رہا ہوں لیکن پہچان نہیں سکتا...... جذبات سے عاری اِس مشینی زندگی میں بھولی یادوں کی سیکڑوں لاشیں اوپر تلے پڑی ہیں...... کس کس کو اُٹھاؤں...... کس کس کو پہچانوں...... کچھ چہرے تو بہت ہی مسخ ہو چکے ہیں۔

شاپ میں آئے تمہیں چند روز ہی تو ہوئے ہیں...... تم نے میری پُرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی ہے...... خدا کے لیے میری ان راہوں سے دُور چلی جاؤ...... اپنے پیلے چہرے کی پھیکی مسکراہٹوں کو سمیٹ لو...... میرے ماضی کے کسی اہم واقعہ سے تمہارا گہرا تعلق لگتا ہے...... ماضی کا حاصل کچھ تلخیاں اور کچھ آنسو ہوتے ہیں...... میں اپنی اِس کاروباری زندگی کی سنگلاخ بنیادوں پر آنسوؤں اور ناکام حسرتوں کی کچی اینٹوں سے کوئی دیوار نہیں بنانا چاہتا۔

کئی بار سوچتا ہوں تم سے پوچھ ہی کیوں نہ لوں ...... کہیں تم بھی سیاہی سے ڈائری پر لکھی وہ تحریر تو نہیں جس کے صفحے پہ پانی گر گیا ہو ...... گو حروف واضح نہیں رہتے لیکن آدمی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کاغذ پر دُھلی تحریر کہیں اُس کی لغزش آمیز زندگی کا کوئی میلا سا واقعہ تو نہیں ...... تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتیں کہ تم کون ہو؟ ...... کیا پاگلوں کی طرح ہنستی رہتی ہو۔ اپنے ہونٹوں سے اِن تلخ مسکراہٹوں کو سمیٹ لو ...... تم مجھے کوئی باوقار لڑکی نظر آتی ہو ...... مجھے خود شرمندگی ہو رہی ہے کہ میرے خدشات سے تمہارا وقار مجروح ہو رہا ہے ...... ماضی کے اندھیرے غاروں میں مَیں نے یادوں کو ٹٹول ٹٹول کر تمہیں پا تو لیا ہے مگر چہرہ صاف نظر نہیں آرہا ...... یہ یاد نہیں آرہا کہ تم کون ہو ...... کہاں ملی تھیں اور کس موڑ پر بچھڑ گئیں۔

وہ کون تھی ...... کہاں ملی تھی ...... میں بھی عجیب اُلجھن میں پڑ گیا ہوں ...... زندگی کی رہگذر پر بیسیوں لوگ ملتے ہیں ...... بچھڑ جاتے ہیں ...... کون ہر کسی کو یاد رکھ سکتا ہے ...... کبھی کبھی تو انجان چہرے بھی مانوس نظر آتے ہیں۔

وہ میرے احساس میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہے ......

اُس کو بھول جانا ہی اچھا ہے۔ یہی سوچ لوں گا کہ دُکان سے سودا خریدنے کے بعد کچھ ریزگاری واپس لینا بھول گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کن اُلجھی راہوں کی بھٹکی ہوئی مسافر ہے ...... اُس کے اُکھڑے اُکھڑے انداز اور بجھے بجھے مایوس اطوار ...... کینٹین میں اُس روز ایک لڑکی سے خواہ مخواہ اُلجھ پڑی ...... میں نے اُسے سمجھا بجھا دیا ...... وہ مایوس سی جو ہر کسی سے اُلجھنا چاہتی ہو ...... اِس کے باوجود وہ جب بھی میرے سامنے آتی ہے ایک مغموم سی مسکراہٹ اُس کے اداس چہرے پر سلگ اُٹھتی ہے۔

"اگر ایسے ہی جھگڑتی رہو گی تو تمہاری چھٹی کرا دی جائے گی!"

"میں خود بھی یہاں کام نہیں کرنا چاہتی ...... کہیں اور نوکری کر لوں گی۔"

وہ دو ہفتے کام پر نہیں آئی ......

بھوکے فقیر سیکڑوں دروازوں پر دستک دیتے ہیں ...... پھر بھی وہ تہی دست شام کو

کسی فٹ پاتھ پر پائے جاتے ہیں۔

ایک شام وہ مجھے پارک میں مل گئی۔

''ارے سنو!''

''جی'' وہ یوں چونک پڑی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''جی صاحب''

''میں تمہارا نام بھول گیا ہوں۔'' میں نے یوں ہی بات بڑھانے کی کوشش کی۔

''عالیہ! آج کل کہاں کام کر رہی ہو......؟''

''کہیں بھی نہیں...... مجھے کام پہ واپس لے لیں۔''

''تم اتنے روز کہاں رہیں؟''

''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی''

''اس روز تم......''

''لوگ ہمیں پارک میں یوں باتیں کرتا دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے...... میری تو کوئی بات نہیں مگر آپ......''

''دنیا کی باتوں کی پرواہ کرنے والے اپنی اُلجھنوں میں اضافہ کر لیتے ہیں...... آؤ یہاں بیٹھو...... میں تم سے ایک ضروری بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے اجازت دیں دیر ہو رہی ہے...... بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں...... میں وقت کی اُن حدوں سے دُور نکل آئی ہوں جہاں لڑکی نوجوانوں کے لیے ایک سوال بن جاتی ہے۔''

میں چوٹ کھایا پارک کے بینچ پر بیٹھ گیا...... وہ سلام کر کے چلی گئی...... اُس نے شاید مجھے غلط سمجھ لیا تھا......

وہ پھر کام پر آ گئی...... وہی فسردگی، وہی مایوسی۔ کبھی کبھی جھجکتی مسکراہٹیں...... پھر مجھے اُس سے بات کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی...... وہ جب بھی ملتی ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتی

......مسکراتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ...... اُس کی مسکراہٹوں میں بیسیوں سوال ہوتے ......

''اُس روز آپ نے مجھے پارک میں کیوں روکنا چاہا تھا ...... وہ کون سی بات تھی جو آپ مجھ سے اکیلے میں کرنا چاہتے تھے ...... میری بے رُخی سے آپ ناراض تو نہیں ہو گئے۔''

میں اُس سے ناراض کیسے ہو سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک اپنائیت تھی ...... میں اُسے ایک بار پھر ملنا چاہتا تھا ...... اُسے بتانا چاہتا تھا کہ عالیہ میں اتنا گرا ہوا انسان تو نہیں جو تم مجھے یوں ٹھکرا کر پارک سے چلی گئیں ...... کم از کم میری بات تو سن لیتیں میری کہانیوں کی عورت کا کردار تو سیتا سے کم نہیں ہوتا ...... عالیہ یقین جانو! میرا وجود ایک سادہ کاغذ ہے ......جس پر بیسیوں نادار اور کمزور انسانوں کی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں ...... میری مسکراہٹیں ...... میرے آنسو ...... میری آہیں ...... میری کہانیاں ...... کچھ بھی تو میرا اپنا نہیں ...... میں لوگوں کے دُکھوں اور غموں کو ترتیب دیتا ہوں تو لوگ مجھے افسانہ نگار کہتے ہیں۔ میری لکھی بیسیوں کہانیاں میری ذات سے منسوب کی جاتی ہیں ...... عالیہ! کہانیاں تو لوگ جنم دیتے ہیں میں تو ان کو صرف کاغذ پر لکھتا ہوں ...... لوگ اس انتشار کے مجرم ہیں ...... میں اس ترتیب کا مجرم ہوں۔ میں نے تمہاری آنکھوں اور پُردرد مسکراہٹوں میں ماضی کی کوئی دھندلی سی تصویر دیکھی تھی جو صحیح فوکس نہیں ہو رہی۔

عالیہ! میری زندگی میں بیسیوں عورتیں آئیں ...... مجھے زندگی کے ہر موڑ پر ایک عورت ملی ...... سماج اور زمانے کی ٹھکرائی ہوئی عورت ...... میں نے اُن کے لیے اس بے حس معاشرے سے انصاف کے تقاضے کیے ...... اُن کے زخموں پر مرہم رکھے ...... اُن کے لیے کہانیاں لکھیں ...... لیکن یقین جانو میں نے آج تک کسی لڑکی سے ایسا پیار نہیں کیا جس کا انجام خودکشی ہوتا ہے ...... یقین کرلو میں کوئی کردار بن کر تمہاری زندگی میں داخل ہونا نہیں چاہتا ...... میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ فیکٹری سے باہر تم مجھے بازار کے کسی پُررونق فٹ پاتھ پہ ملو اور لوگ ہمیں یوں دیکھیں جیسے ہم کسی کہانی کے اُلجھے ہوئے کردار ہوں۔

زندگی کے آداب سے بھٹکے ہوئے کچھ لوگ سادہ لوح لڑکیوں کی زندگیوں میں حسین خواب بن کر داخل ہوتے ہیں اور رسوائی کی طویل و تاریک راہوں پر انہیں بھٹکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عالیہ بھی ایسے ہی زخموں سے چُور اپنے آپ کو اس مشینی زندگی میں تحلیل کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

عالیہ اور میں ایک ہی جگہ کام کرتے ...... ہفتوں گزر گئے ...... اس سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ میں سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھا بیسیوں بے ترتیب خیالوں کو کہانی کے فریم میں جوڑتا رہا ...... کچھ دنوں سے وہ پھر ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنے لگی تھی ...... ایک روز ہسپتال گیا ...... ایکسرے تھیٹر میں مل گئی۔

''عالیہ کیسی ہو ...... اور ہسپتال کیسے آئیں۔''

اس نے پیلے کاغذ والا لفافہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''ڈاکٹر کہتا ہے ...... تمہیں ٹی بی ہے ...... سکریننگ کے لیے آئی ہوں۔''

پھر ہم کافی دیر فیکٹری کی باتیں کرتے رہے ...... میں جب تھیٹر سے باہر نکلا تو وہ باہر میری منتظر تھی۔

''انور صاحب! آج لنچ میرے ساتھ کریں۔''

''تم رہتی کہاں ہو......؟''

''ہسپتال کے کوارٹروں میں ...... میری بہن یہاں نرس ہے۔''

دوپہر کا کھانا میں نے عالیہ کے ساتھ کھایا۔

''انور صاحب! آپ ایک روز مجھے پارک میں روک کر یہی پوچھنا چاہتے تھے نا کہ......!''

''ہاں عالیہ! میں تم سے یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو ...... اس سے پہلے بھی میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔''

''مقصود صاحب کے ہاں ......'' عالیہ کی آواز بھرا گئی ...... اس کی موٹی موٹی

آنکھوں سے آنسو گرنے لگے......"

"وہ غالباً آپ کے دوست تھے...... میں تو پہلے روز ہی آپ کو پہچان گئی تھی...... شاید آپ مجھے نہ پہچان سکے...... میں یہ چاہتی بھی نہ تھی...... میں نے کئی بار سوچا اس فیکٹری سے چلی جاؤں جہاں ہر قدم پر میری یادوں کی ٹوٹی قبریں میری راہوں میں حائل ہیں۔ کہیں گر پڑی تو اُٹھانے والا ہی کوئی نہیں ہوگا...... پھر سوچتی ہوں کہ ان مشینوں کا ساتھ اچھا ہے۔ ان کی بے رخی زیادہ سے زیادہ یہی ہوتی ہے کہ ایک اُنگلی کٹ جاتی ہے۔ انسانوں جیسے دیے زخم تو نہیں ملتے جو وقت کے ساتھ ساتھ ناسور بن جاتے ہیں اور ذرا سی ٹھیس پہ مسکرانے لگتے ہیں...... انور صاحب! اپنی سنائیے...... ماضی کی باتوں میں کیا رکھا ہے...... بچپن میں بڑے قبرستان کی ایک قبر پر آنکھیں بند کر کے سیدھی قطار میں کیلیں گاڑا کرتے تھے...... شاید مقدر کی کوئی کیل میں نے اُلٹی گاڑ دی ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں...... وقت زخم مندمل کر دیتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ حالات کی رنگینی جونک مندمل زخموں کو چاٹ لیتی ہے اور یادوں کے سوئے ناسور مسکرا اُٹھتے ہیں...... عالیہ کن یادوں کو جھنجھوڑ بیٹھی ہے...... قصور اُس کا بھی تو نہیں...... میں کافی دنوں سے سانپ کا بل کھود رہا تھا۔ یادوں کے ناگ نے ڈس لیا ہے اور اب عالیہ کے سامنے آنسو بہا رہا ہوں۔

عالیہ اچھا ہی ہوتا اگر تم نہ ملتیں...... حیات کے صفحوں سے ڈھلے مقصود کی یاد دل سے محو ہو جاتی...... مگر عالیہ تم نے بہت دیر کر دی...... وہ تمہارا انتظار نہ کر سکا۔ تم مقصود کو پھولوں بھری بہار میں اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں...... اب یہاں کیا لینے آئی ہو!...... اس خزاں آلود موسم میں مقصود کی قبر پر تم کو سوکھی پتیاں بھی نہ ملیں گی...... آنسوؤں اور دکھوں میں ڈوبی زندگی میں تم کب تک غوطے کھاتی رہوگی...... میری مانو...... کسی ساحل کی تلاش کرو...... تم میں جوانی کی کچھ رعنائیاں اب بھی باقی ہیں۔

"انور صاحب! خدا کے لیے خاموش ہو جائیے...... یہاں سے چلے جائیے...... میرے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکتے تو انھیں کیوں چھیلے جا رہے ہیں"

ہسپتال ایکسرے کرانے کیا گیا تھا...... یادوں کے زخم سمیت لایا...... یادیں تو صدیوں زندہ رہتی ہیں۔ یہ تو صرف ایک دہائی کی بات تھی...... انہی قدموں پہ چلتے ہوئے میں پارک کی پتھریلی سیڑھیوں پر اکیلا آن بیٹھا...... برسوں بعد مجھے اکیلا اور اداس دیکھ کر برگد کا بوڑھا درخت شبنم کے آنسو رونے لگا۔

''انور! درخت کے تنے پر چاقو سے کھدا عالیہ کا نام ہماری محبت کی پہلی یادگار ہے ...... اس پیڑ کی چھاؤں تلے ہم نے اکٹھے زندگی گزارنے کی قسم کھائی تھی۔''

یہ آج مجھ سے کون الجھ رہا ہے۔ مقصود کہاں ہے؟ وہ تو معدوم ہو چکا ہے۔ شاید وہ مقصود کا پرتو تھا جو ان سیڑھیوں پہ سویا ہوا تھا...... میری آہٹ پہ جاگ اٹھا اور مجھ سے دست و گریباں ہو گیا۔ شاید میں تھک گیا تھا، میں رک گیا تھا اور برسوں پیچھے میرا ماضی مجھ سے آن ملا ہے۔ جیسے مقصود کہہ رہا ہو۔

''عالیہ اور میں نے جیون بھر ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''مقصود! یہ فیصلے اتنے ہنگامی نہیں ہوا کرتے!''

''عالیہ بہت خوبصورت ہے انور!''

سنہری مٹی میں لپٹے سگریٹ بہت تلخ ہوا کرتے ہیں۔

مگر جذبات کی دبیز دھند میں تلخیاں کہاں نظر آتی ہیں۔ مقصود نے عالیہ سے کورٹ میرج کر لی۔ محبت کی خوب تشہیر ہوئی۔ میں نے مقصود اور عالیہ کی داستان اخبار میں پڑھ لی۔ میں ان دنوں کراچی ڈیوٹی پر تھا، میں اپنے دقیانوسی پن پر کچھ نادم بھی تھا۔ مقصود کو مبارک باد دینے اُس کے گھر گیا۔ میں نے اُس روز عالیہ کو پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ کچھ جذباتی فیصلے زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ عالیہ اور مقصود نے والدین کے فیصلوں کے برعکس ایک دوسرے کو جیت لیا تھا۔

کوئی ہار گیا۔

رسوائیاں سمیٹ کر عالیہ کا باپ غازی پور فیکٹری ٹرانسفر ہو گیا۔ کام کی نوعیت کی

وجہ سے کراچی میں میرا stay لمبا ہو گیا۔ پھر میں نے شام کی کلاسوں میں داخلہ لے لیا۔ کبھی کبھی مقصود کا خط ملتا۔ وہ بہت خوش تھا اور مجھے خوشی تھی کہ جوانی کے خوبصورت لمحوں میں بھی اس کی یادوں میں میرے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ اُس کے ہر خط میں عالیہ کا ذکر ہوتا تو میں پہروں سوچا کرتا۔ بہنوں کی شادی ہو جائے، چھوٹے بھائیوں کی تعلیم مکمل ہو جائے تو پھر میں بھی اپنے خطوں میں مقصود سے کسی عالیہ کا ذکر کیا کروں گا۔ پہروں میں ایسے خوابوں میں کھویا رہتا۔ گھڑیال کی ٹن ٹن مجھے چونکا دیتی۔ فزکس اور کیمسٹری کی بنیادوں پر استوار کی جانے والی زندگی میں جذبات کی گنجائش بہت کم نکلتی۔ آہستہ آہستہ مقصود کے خط آنے بند ہو گئے۔ پتہ چلا کہ وہ بھی اپنی بیوی کو لے کر بنگال ٹرانسفر کرا گیا ہے۔

پھر جو مسموم ہوائیں چلیں۔ صدیوں سے ایک دوسرے کے پکڑے ہاتھ چھوٹ گئے۔ کسی کا دل ٹوٹا کسی کا گھر ٹوٹا، اور کسی کا ملک ٹوٹ گیا۔ بادبان پھٹ گئے، کشتیاں ڈوب گئیں۔ دست و گریباں جو ہوئے تو سارے دامن چاک ہوئے دوستوں نے لاشوں کی دیواریں اٹھا کر اپنے گھر بنائے اور ہم اپنی دہلیز پہ منتظر رہے کہ سمندر پار سے کوئی آئے گا۔ ہم زندگی بھر کس کی راہ دیکھتے رہیں گے۔

بہنوں کو رخصت کیا، بھائی کہیں کنارے لگے تو میں بھرے گھر میں تنہا رہ گیا۔ جنگی قیدی آنا شروع ہوئے۔ مقصود بھی واپس آ گیا مگر ادھورا سا۔ اکیلا سا۔ دل اُسے چھوڑ گیا تھا، دماغ وہ خود چھوڑ آیا۔ اُس کے باپ سے معلوم ہوا کہ وہ اندر کمرے میں ہے۔ تاریک کمرے کی کھڑکی میں کھڑا سایہ دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے روشنی کی۔ مقصود مجھ سے لپٹ گیا۔

''اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟''

''روشنی اچھی نہیں لگتی۔ کرنوں میں ایک چبھن سی ہے۔''

''اپنی سناؤ۔''

اپنی کیا سناتا۔ مقصود جانے مقدر کی کن سیاہیوں سے جی لگا بیٹھا تھا۔

''خیریت تو ہے۔ عالیہ کیسی ہے؟''

''وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔''

''مزید کچھ نہ پوچھو انور۔ اگر کسی کہانی کے لیے پلاٹ چاہتے ہو تو سنو عالیہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

مقصود کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ غموں سے نڈھال پیلے چہرے کی جھریاں کچھ اور نمایاں ہو گئیں۔

''انور میں اس لیے زندہ ہوں کہ تم آؤ گے۔ میری کہانی لکھو گے۔ میں مر جاؤں گا تو یہ کہانی مکمل ہو جائے گی۔ چھپ جائے گی تو میری شادی کی طرح موت کی بھی تشہیر ہو گی اور جب لوگ یہ جان جائیں گے کہ مقصود بے قصور تھا تو برگد کے پرانے درخت سے عالیہ کا نام مٹا دینا۔''

زخموں سے چُور غیرت وحمیت کے دریدہ کفن میں لپٹی مقصود کی لاش قہقہے لگاتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی۔ کمرے سے اُٹھ کر میں باہر چلا گیا۔ مقصود کا باپ اور میں رات گئے تک اُداسیوں میں گھرے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا رہا...... گانے گاتا رہا۔

''بیٹا! مقصود کا برا نہ ماننا۔ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔''

اپنے آپ سے ناراض مقصود سے رُوٹھ کر بھی میں کیا کر لیتا۔ اُس کے بلند قہقہوں کی چبھن اور آنسوؤں کا تلخ سا احساس کتنا تکلیف دہ تھا۔ بہتر تو یہ تھا کہ یہ غیر متوازن زندگی موت کی پُرسکون گود میں سو جاتی۔

رات گئے میں وہاں سے اُٹھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا گا رہا تھا۔

''کوئی نہیں میرا اس دنیا میں آشیاں برباد ہے۔''

پھر کئی روز میں مقصود کے یہاں نہیں گیا۔

کبھی اُدھر سے گزر ہوتا تو راستہ تبدیل کر لیتا۔ مجھ سے مقصود کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

پھر ایک روز جو گیا تو شام کے خنک دُھندلکے میں مکان کے صحن میں چار پائیوں پر بیٹھے سوگوار لوگ ملے...... مجھے دیکھ کر مقصود کا باپ رو پڑا...... ہنس دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے ایک بھیانک جنون تھا جو میں نے مقصود کی آنکھوں میں بھی دیکھا تھا۔ قبر پہ میں نے پھول چڑھائے۔ آنسو بہائے۔ اسی ڈھیری پہ کئی خودرو پھول بھی اُگ آئے۔ زندگی کی سوگوار راہوں پر مقصود کی سیکڑوں یادیں بکھر گئیں اور وقت کی گرد تلے چھپتی چلی گئیں۔ مگر مجھے وہ گیت یاد رہا۔

پھر میں وہ گیت بھی بھول گیا اور ماضی کی سنسان ویران گلیوں کو بھی۔ وقت اور حالات کے پُر رونق بازار میں نکل آیا۔ اس مصروف زندگی میں وہ احساس مر گئے جو اُپلوں کی بھٹی کی طرح دھیرے دھیرے سلگتے رہتے ہیں۔ مگر اس بازار میں اُپلوں کا دھواں کہاں۔ یہاں تو کارخانوں کی فلک بوس چمنیاں...... بجلی کے لمبے لمبے کھمبے دیو ہیکل مشینیں اور ان مشینوں میں بھٹکتی ہوئی عالیہ نظر آئی تو ماضی کی یادیں پھر سے سلگ اٹھیں۔

عالیہ مجھے پہچان گئی۔ مجھ سے دُور بھاگتی رہی۔ اور میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوا اُسی ویران گلی میں آنکلا۔ کچھ آنسو اور کچھ گیت اور مشینوں کی وہی گڑگڑاہٹ۔ اُداس عالیہ...... جیسے وہ میرے غم میں برابر کی شریک تھی۔ عالیہ کے اُس کردار سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا جو مقصود کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ نفرت کی خلیج کے اُس پار مجھے ایک مظلوم عالیہ بھی نظر آئی۔ کاش میں اس خلیج کو پار کر کے اُس سے پوچھ سکتا کہ وہ مقصود کو چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی...... اُس کے وعدے کیا ہوئے...... وہ بندھن کیوں ٹوٹ گئے...... وہ سیتا کیوں مر گئی۔

ایک سوال میں اپنے آپ سے بھی پوچھتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مقصود کی زندگی کو داؤ پر لگا کر خود بھاگ گئی تھی لیکن یہ درد بھری مسکراہٹیں اور پیلے چہرے کی اُداسیاں وہ کہاں سے سمیٹ لائی ہے۔ وہ کون سا انجانا دُکھ ہے جو عالیہ کی جوانی کو چاٹے جا رہا ہے۔ میں نے ایک روز اُسے بلا کر مشورہ دیا کہ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آرام کرے۔

"ہاں صاحب میں بہت تھک گئی ہوں۔"

دوسرے ہفتے بھی وہ کام پر نہ آئی۔ اُس نے چھٹی کی درخواست بھیج دی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے گھر پہنچ گیا۔

''عالیہ تُو کس کے دکھوں کو دل سے لگائے بیٹھی ہے۔''

''صاحب ایسی تو کوئی بات نہیں۔ معمولی حرارت رہتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تمہیں فرسٹ سٹیج کی ٹی بی ہے۔''

''عالیہ حوصلہ رکھو۔ فرسٹ سٹیج کی ٹی بی اور موت کے درمیان بہت طویل فاصلے ہیں۔''

''انور صاحب میں یہ فاصلے بہت جلد طے کر لینا چاہتی ہوں۔''

''زندگی کیسی بھی ہو وہ عزیز ہوتی ہے۔''

''زندگی کے کچھ لمحات عزیز ہوتے ہیں اور وہ لمحے حالات نے مجھ سے چھین لیے ہیں۔ اب دُکھوں کے سوا اس زندگی میں رکھا بھی کیا ہے۔''

''اس میں حالات کا قصور نہیں عالیہ۔ اِن راہوں پر یہ کانٹے تم نے خود ہی بکھیرے ہیں۔ تحفظ کی دیواریں تمہی نے گرا ڈالی ہیں۔''

''وہ کیسے......؟''

''تم مقصود کو چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھیں؟''

''شاید آپ کو معلوم نہیں۔ مقصود نے میرے منع کرنے کے باوجود غازی پور ٹرانسفر کرائی تھی۔ جب ملکی حالات خراب ہوئے تو واپسی کے راستے بند ہو گئے۔ ایک روز مکتی باہنی والے آئے اور مجھے گھر سے اٹھا کر لے گئے۔ میں نے لاکھ واسطے دیے۔ بنگالی بولی۔ اس دھرتی کے سارے رشتوں کے ثبوت دیے......

......میں تمہاری اس دھرتی کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ بنگالی ہے۔''

''تم ایک پنجابی کی بیوی ہو...... تم ناپاک ہو گئی ہو...... ہم اس دھرتی کو ناپاک لوگوں سے پاک کر دیں گے۔''

...... پھر انہوں نے مجھے قتل کیا...... ایک بار نہیں...... بیسیوں بار...... عالیہ مرگئی۔ عالیہ کی لاش بکتی رہی......

پہلے میں ٹوٹی...... پھر میرا ملک ٹوٹا۔ مقصود کو فوج والے پکڑ کر لے گئے۔ وہ جنگی قیدی ہو گیا۔ آگ اور خون کے دریا میں بہتی ہوئی میں انڈیا پہنچ گئی۔ پھر میں ریل کے ایک ٹکٹ کی طرح بکتی رہی...... سفر کرتی رہی۔ اور جب آخری سٹیشن سے سرحد پار کی تو سب کچھ لٹ چکا تھا۔ بابا تو پہلی ٹھوکر ہی میں بکھر گئے تھے اور مقصود اپنے حواس کیمپ ہی میں چھوڑ آیا تھا...... اچھا ہوا مر گیا...... میں اپنی بہن کے پاس یہاں ہسپتال آ گئی۔"

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ دُکھوں کی پوٹلی سر سے اتار دی...... آنکھوں کے آنسو سمیٹ لیے۔ دُور خلاؤں میں گھورنے لگی۔

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کن خدشات کا شکار ہیں۔ کتاب تو کسی نہ کسی کے سامنے کھولنی ہی پڑتی ہے۔ آپ کے سوا میرا ہے کون۔ میں نے تو صرف باقی بچ جانے والی گنتی گننی ہے۔ کتنا اور چلنا ہے یہ بھی معلوم نہیں۔ اکیلے چلتے ہوئے کہیں میں تھک کر بیٹھ جاؤں...... سانس ٹوٹنے لگے۔ کوئی تو ہو جو عزت سے مجھے زمین میں اُتار سکے...... اور آپ تو بہت اچھے انسان ہیں۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

...... اور اپنے دہکتے سب انگارے میری ہتھیلی پر دھر دیے۔ بھیگی ہوئی شام کے سرد اُداس لمحے...... پھیکی مسکراہٹوں میں اُلجھی عالیہ...... ایسے میں مَیں نے احساس کے افق پہ ایک دھواں دیکھا۔ شاید کوئی آگ سلگ اُٹھی تھی۔

"عالیہ! میں تمہارے دُکھ بانٹ لینا چاہتا ہوں۔

ان سوگوار راہوں پر تم کب تک اکیلے بھٹکتی رہو گی۔ اس روگ کو Streptomyein کے انجکشنوں سے مار ڈالو۔"

عالیہ مسکرانے لگی۔ چائے کی پیالی اس نے میری طرف بڑھائی۔ اور شکر دان ہاتھ

میں پکڑا دیا۔ ''چینی خود ڈال لیں میں تو تلخ چائے پسند کرتی ہوں۔''

''عالیہ! میں تم سے کچھ کہہ رہا تھا۔''

''آپ میرے دکھ بانٹ لینا چاہتے ہیں...... سوکھے تنوں کو سینچ کر کیا کریں گے۔ اور میں اس قابل بھی کہاں ہوں۔ نہیں...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''یہ میرے اندر کی آواز ہے عالیہ!''

اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کا سرد ہاتھ میں نے تھام لیا۔ اُس کے آنسو میں نے سمیٹ لیے۔ سنگ مرمر کی طرح سرد ہوتی اُس کی انگلیاں میں نے چوم لیں۔''

''عالیہ! تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''مگر میں تو......

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔''

''آپ میرے لیے اپنی زندگی کیوں برباد کرنا چاہتے ہیں...... آپ کو کوئی اچھی، خوب صورت بیوی مل سکتی ہے۔''

''میری آرزوؤں میں کسی تاج محل کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ میں تو چھوٹی چھوٹی اینٹیں یک جا کر کے ایک کٹیا آباد کر لینا چاہتا ہوں...... جو صرف میری ہو۔''

''میں اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کیسے کر سکتی ہوں۔''

''عالیہ! میرا ساتھ دو...... ہم دونوں مل کر مستقبل کی راہوں سے ماضی کے بکھرے کانٹے چن لیں گے۔''

''انور صاحب! مجھے تنہا چھوڑ دیں...... مجھے سوچ لینے دیں۔ کوئی فیصلہ کر لینے دیں۔''

دوں کے فیصلے تو سوچوں کی گرفت میں نہیں آتے مگر پھر بھی میں نے کئی بار سوچا۔ کہیں یہ جذباتی فیصلہ آگے چل کر میرے اور عالیہ کے درمیان کوئی دیوار نہ کھڑی کر دے۔ وہ ایک ہیرو..... جو ایک بار اغوا بھی ہو چکی ہے۔ عالیہ کے لیے پھر واپسی کا راستہ بھی نہیں ہو

گا۔ قبر سے نکال کر اسے کہیں پھر کفن نہ پہنانا پڑ جائے۔ سوچیں دبک کر لاشعور کے اندھیروں میں چُھپ گئیں۔ اندر کی آواز غالب آ گئی۔

عالیہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ مجھے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ عالیہ اتنی سرد کیوں ہے۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ میرے اندر کا انسان ابھی زندہ ہے۔ میں عالیہ کو اپنا کر یہ ثابت کر دوں گا کہ سماج اور معاشرے کی نظروں میں عالیہ کا مقام کچھ بھی ہو میں اُسے اُس عورت کا مقام دوں گا جو میرے بچوں کی ماں، میرے گھر کا سکون، میری شاموں کا انتظار اور میرے سارے دن کی تھکاوٹ کا حسین علاج ہوگی۔

سیکڑوں خیال میری راتوں کا مقدر بن گئے۔ کاش عالیہ بھی میرا مقدر بن جاتی۔ میں نے عالیہ کو بہت مجبور کیا۔

''اچھی طرح سوچ لو کہیں تم کوئی ٹوٹا ہوا برتن ہی نہ خرید بیٹھو جسے عین چوراہے میں پھوڑنا پڑ جائے۔''

''عالیہ میں مقدر کا کچھ زیادہ ہی قائل ہوں۔''

عالیہ نے اپنے مقدر کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیے۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ عالیہ تو اس روز دوا لینا بھی بھول گئی۔ کھانے کے بعد دونوں پکچر چلے گئے۔ چار روز میں عالیہ سے نہ مل سکا۔ ایک روز وہ خود ہی میرے گھر آ گئی۔

''انور صاحب شام کا کھانا آج ہمارے گھر کھانا ہے۔''

کھانے کی میز پر سب چپ رہے۔ عالیہ کی بہن اسے انجکشن دے کر رات کی ڈیوٹی چلی گئی۔ میں اور عالیہ رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔

''عائشہ سے مشورہ کر لیا؟ وہ کیا کہتی ہے۔''

''نہیں تو......''

''عالیہ میں جلد شادی کر لینا چاہتا ہوں۔''

''میرا ایکسرے تو کلیر ہو جائے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ انور صاحب۔ میں آپ

کی ہوں۔ میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ ایک راز ہے جو میں آپ کو بتا دینا بہت ضروری سمجھتی ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔"

جانے وہ کیا بات تھی۔ جسے بتاتے ہوئے عالیہ جھجک رہی تھی۔

وہ صوفے سے اٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"انور صاحب باہر بہت اندھیرا ہے۔"

"عالیہ تم کوئی خاص بات بتانا چاہتی ہو!"

وہ میری طرف مڑی۔ جذبات سے سرخ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ گریبان پہ رکھے اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ دوسرے لمحے اس کی قمیض کا دامن چاک ہو گیا۔ ایک ثانیے کے لیے میری نظریں اٹھیں۔ عالیہ کے سینے پر زخموں کے گہرے گھاؤ تھے۔ مندمل سیاہ زخم۔ مصنوعی چھاتیاں میز پہ پڑی تھیں۔

"انور صاحب اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میری ممی کی کوکھ سے جنم لینے والے میرے بھائیوں نے میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ جب پھر بھی مطمئن نہ ہوئے تو میری چھاتیاں کاٹ ڈالیں۔"

عالیہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں بھی اس معاشرے کے کیچڑ میں پلنے والا ایک کیڑا ہوں۔ میری انسانیت اور میرا ضمیر جس میں ہکی کڑھی کی طرح اُبال آ گیا تھا، عالیہ کے سینوں کے زخموں کے نیچے دبا دم توڑ رہا تھا۔

میں نے ضمیر کی لاش دیکھی تو وہاں سے بھاگ نکلا۔

□□□

ہرڈلز

"خان! جب میں ٹریک کے تیسرے موڑ پہ پہنچا تو میں جان کے کندھے سے جا لگا۔ آخری ہرڈل تک میں اُسے کور کرتا رہا۔ Finish line اور آخری ہرڈل کے درمیان میری جیت سمٹ آئی تھی۔ اس محدود فاصلے میں میرا Career بکھرا پڑا تھا جسے میں نے ہر حال میں سمیٹنا تھا۔"

بنچ سے وہ اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ پاکستان کلر کا کوٹ اُس نے بازو میں لے لیا۔

"خان! تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں۔ میں کہہ رہا تھا۔ کہ میں بابا سائیں حاضر حضور کو یاد کرنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ ریس آج مجھے ہر صورت جیتنی تھی۔ یہ میرے ملک کے وقار کا مسئلہ تھا۔ میں جان کو شکست دے کر میڈل جیت سکتا تھا۔ اب کے تو میں صفیہ سے بھی وعدہ کر کے آیا تھا کہ کامن ویلتھ گیم سے اگر گولڈ میڈل جیت لایا تو......اُس نے میرا بہت انتظار کیا ہے......خان! جب میں فیتے سے جا لگا تو مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ لوگ میرا ٹریک سوٹ ہوا میں اچھال رہے تھے۔ مجھے چوم رہے تھے۔ جان نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں نے پاکستان کا جھنڈا تھام لیا اور پورے ٹریک کا ایک راؤنڈ لگایا۔ سیٹیاں......شور اور تالیاں۔ میں نے انگریز کو بہت فراخ دل پایا۔ پاکستان کا ترانہ بجنے لگا۔ باقی سب جھنڈے سرنگوں ہو گئے۔ وکٹری سٹینڈ کی اونچی سیڑھی پہ کھڑا میں آسمان کو چھونے لگا۔ میں نے جان کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر چار سو میٹر ہرڈلز کا گولڈ میڈل جیت لیا تھا۔"

وہ میرا بچپن کا دوست عبداللہ خان تھا۔ پاکستان کا نامور اتھلیٹ جو ابھی ابھی کامن ویلتھ گیمز سے وطن واپس آیا تھا۔ میں اُسے ریفریشمنٹ روم لے گیا۔ رُوبی ہم دونوں کے لیے چائے بنانے لگی۔

''یہ تمہاری بھابھی ہیں۔''

''ارے! تم نے ابھی سے شادی کر لی ہے۔ تم تو مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہو۔ ہمارا کوچ کہتا ہے کہ اتھلیٹ کو اٹھائیس سال سے پہلے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ انگلینڈ میں تو کئی لڑکیاں مجھ سے شادی کے لیے تیار تھیں۔ مگر کہاں صفیہ اور کہاں ...... اب تو میں گولڈ میڈل جیت لایا ہوں اب تو صفیہ سے میری شادی ہو جائے گی۔''

وہ مجھے دیر تک اپنی تصویریں دکھاتا رہا۔ ایک اتھلیٹ کی حیثیت سے اُس نے کتنے معرکے سر کیے تھے۔ سادہ مزاج انسان تھا جس نے کئی ملکوں میں جا کر پاکستان کی نمائندگی کی تھی مگر اس میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ گاڑی کا وقت ہو رہا تھا۔ باہر پلیٹ فارم پر آ گئے۔

عبداللہ آج بھی ویسا تھا جیسا وہ ماسٹر مہدی کی کلاس میں تھا۔ اُس نے پاکستان کلر کا کوٹ پہن رکھا تھا جس کی جیب پر کامن ویلتھ کا بیج لگا ہوا تھا۔ بازو پر اب بھی اُس نے چمڑے میں مڑھا تعویذ باندھ رکھا تھا۔ تچ کی آواز سے تھوکنے کی اس کی عادت ابھی تک نہیں گئی تھی۔

عبداللہ خان میرا کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ کلاس کا نالائق ترین لڑکا تھا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا۔ دونوں اکٹھے مسجد قرآن پڑھنے جایا کرتے۔ امام مسجد عبداللہ سے بہت نالاں رہتے۔ انتہائی مشق کے باوجود بھی وہ نماز کے الفاظ صحیح طور پر ادا نہ کر سکتا۔ جب میں نے قرآن ختم کیا اس وقت عبداللہ نماز کے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ اکثر نماز میں اُس کی ہنسی چھوٹ جاتی تو گھنٹوں میاں جی اُس کی کن پکڑی کراتے۔ یہی حال اُس کا سکول میں بھی تھا۔ اُسے اُردو کی ساری کتاب یاد تھی مگر لفظوں کی پہچان نہ تھی۔ اُسے بار بار تھوکنے کی عادت تھی۔ ٹاٹ کے آس پاس فرش پر تھوک تھوک کر اُسے گندا کر دیتا۔ سزا کے باوجود اس کی یہ

عادت نہ گئی تھی۔ پہلی دو جماعتوں میں اس نے دو دو سال لگا دیے۔ تیسری جماعت میں اس نے تین سال لگا دیے۔ اُسے تیسری کی اردو کی کتاب میں صرف ابو خان کی بکری والی نظم یاد تھی۔ میں اُس سے کئی جماعتیں آگے نکل گیا۔ وہ پھر بھی میرا دوست رہا۔

میں اُن دنوں ہائی سکول جایا کرتا تھا۔ وہ واپسی تک میرا انتظار کرتا پھر ہم شام دیر تک فاطمہ بی کے آنگن میں کانچ کی گولیوں سے کھیلا کرتے۔ ہر شام وہ اپنی قمیض کی بغلی جیب گولیوں سے بھر لاتا۔ کچھ مجھے بھی دے دیا کرتا۔ تیسری جماعت میں تین بار فیل ہو جانے سے اُس کا دل تعلیم سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے رحمت کی دکان پر اردو کی کتاب بیچ ڈالی۔ اُس دن ہم نے صوفی کی دُکان سے جلیبیاں کھائیں۔ دوسرے روز حساب کی کتاب بھی بک گئی۔ تختی اس نے توڑ ڈالی۔ پھر وہ کبھی بھی سکول نہ آیا۔

عبداللہ خان کے چلے جانے سے سکول کے سب ہنگامے سرد ہو گئے۔ گاؤں کی گلیاں سونی ہو گئیں۔ فاطمہ بی کا آنگن سنسان ہو گیا۔ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ اس کے بنا باز کی چاندنی راتیں اُداس ہو گئیں تھیں۔ عبداللہ کے بغیر کسی کو بھی راجو کے کھیت سے خربوزے چرانے کی جرأت نہ ہوتی۔ لومڑ کے شکار کے گُر صرف عبداللہ ہی جانتا تھا۔ اُس کے بعد ہم لوگ کبڈی اور کشتی کے اکھاڑے کو بھول ہی گئے۔ فاختہ کے انڈوں اور طوطوں کے بچوں کا سراغ صرف ذُتو ہی لگا سکتا تھا۔ جب بھی جاڑے کی سرد طویل راتوں کو ہم احمد کے حجرے اکٹھے ہوتے۔ باتوں کے سلسلے چل نکلتے۔ بات عبداللہ کے ہنگاموں پہ آ کر ختم ہوتی۔ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ جب کہ ہر محفل میں اُس کی ضرورت تھی۔

اُن دنوں میں میٹرک میں تھا۔ پتہ چلا کہ عبداللہ خان گھر واپس آ گیا ہے۔ اُس روز اس کی ماں نے پورے گاؤں میں گڑ بانٹا۔ جمعرات کو پیر شاہ سوار پہ شیرینی بانٹنے چلی گئی۔

میں اس سے ملنے گیا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا۔ وہ اب ایک گبھرو جوان تھا۔ ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پہ پھیل گئی۔ جیسے وہ اس مسکراہٹ میں ذُتو کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''کہاں رہے ہو تم آج تک؟''

''خان! میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اب میں لانس ہوں۔ ۵ بلوچ رجمنٹ میں ہوں۔ اور میں نے فرسٹ فرسٹ رومن اردو کا کورس بھی کر لیا ہے۔ کہو تم کون سی جماعت میں ہو۔''

پھر اس نے سیاہ رنگ کا بکسا کھولا۔ اُس سے پی ٹی شوز نکال کر مجھے دیے۔

''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ انہیں پہن کر خوب دوڑا کرو۔ جانتے ہو میں اس دفعہ پورے بریگیڈ میں فسٹ آیا ہوں۔ کافی تولیے، بنیان، قمیصیں اور کپ انعام میں ملے ہیں۔ جو تمہیں پسند آئے لے جاؤ۔''

چند روز کی چھٹی کاٹ کر عبداللہ واپس چلا گیا۔ فاطمہ بی کا آنگن ایک بار پھر ویران ہو گیا۔ میرے پی ٹی شوز پھٹ گئے۔ عبداللہ جانے کب نائیک ہوا۔ ماضی سے بے گانہ میں اپنی تعلیمی مصروفیات میں غرق رہا۔ کئی سال گزر گئے۔ گاؤں کو چھوڑے عرصہ ہو گیا تھا۔ جانے باقی ساتھی کدھر گئے تھے۔ گاؤں کے دوست یوں بکھر گئے جیسے کھلیان پہ بکھرا اناج طوفان کی زد میں آ گیا ہو۔ میں عرصہ تک فکرِ روزگار میں سرگرداں رہا۔ ایک روز انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے آفس میں عبداللہ خان کی تصویر دیکھی۔ جے۔ سی او ون امریکن پائلٹ اتھلیٹ کے ساتھ اس نے منہ یوں بھینچ رکھا تھا جیسے ابھی وہ وسل کی آواز سے تھوک دے گا۔

ٹریک سوٹ میں لپٹا وہی عبداللہ تھا۔ فاختہ کے انڈوں اور طوطوں کے بچوں کا سراغ لگانے والا۔ مونگ پھلی کا رسیا جسے تیسری کی اردو کی کتاب میں صرف ابو خان کی بکری والی نظم یاد تھی۔ میں دیر تک بچپن کی یادوں میں کھویا رہا۔ مجھے ایک معقول نوکری مل گئی۔ عبداللہ نے کئی نئے ریکارڈ قائم کیے۔ مٹی سے لپے اُس کے گھر کی کارنس کپوں سے بھر گئی۔ ایک عرصہ بعد آج عبداللہ خان سے ملاقات ہو گئی۔

روبی ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ مقامی سکول میں استانی لگ گئی تھی۔ آمدن معقول تھی۔ ہمارے یہاں ایک بے بی بھی آ گئی۔ اچھے دن گزر رہے تھے۔ عبداللہ فوج سے

ریزروپنشن آ گیا۔ اُسے ہماری فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ صفیہ اب اس کے دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کے بعد ہر سال صفیہ نے ایک بچے کو جنم دیا جیسے عبداللہ کا جیتا ہوا ہر کپ ایک کھلونا ہو اور ہر کھلونے کے لیے ایک بچے کی ضرورت ہو۔

پھر عبداللہ خان پریشان رہنے لگا۔ آمدن کم تھی۔ بچے زیادہ۔ بڑا لڑکا بیمار ہوا۔ کافی پیسے اُس کی بیماری پہ اُٹھ گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ عبداللہ خان کی کمر ٹوٹ گئی۔ عبداللہ نے ایشیا اور پاکستان کے سابقہ ریکارڈ بہتر کیے تھے۔ اب کے مقامی کھلاڑیوں نے ہی اُسے Beat کر دیا۔ اس کے بعد وہ ٹریک میں کبھی نہ اُترا۔ اس کا سبز رنگ کا ٹریک سوٹ گرد میں یوں لپٹا رہا جیسے فکرِ روزگار کا مارا اتھلیٹ اپنے ٹریک کی لائن بھول گیا ہو اور اُسے ڈس کوالیفائی کر دیا گیا ہو۔

عبداللہ بہت ملنسار خوش مزاج دوست تھا۔ وہ اکثر میرے یہاں آتا۔ ہم دیر تک ماضی کی سیلی یادوں کو اُدھیڑتے رہتے۔ گاؤں کا پرائمری سکول، ماسٹر صابر مہدی، رحمتا دوکان دار، بچا جو جولاہا...... اکثر یہی موضوع ہوتے۔ پھر آہستہ آہستہ پریشانیوں کی زردیاں عبداللہ کے چہرے پر پھیلتی چلی گئیں۔ پہلے سے چہرے کو سکیٹر کرتی کی آواز سے وہ فرش پر تھوکتا رہتا۔ مٹی ناخنوں سے کریدتا رہتا۔ بچے اُس کی گردن میں باہیں حمائل کیے اُس کی پیٹھ پہ چڑھتے رہتے، گرتے رہتے۔ وہ اپنے آپ میں غرق رہتا۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ محسوس ہوتا کہ عبداللہ ان پریشانیوں کی گہرائیوں سے واپس ہی نہیں آئے گا۔ صفیہ...... وہ بھی پریشان رہتی جیسے اس نے یہ بچے جن کر کوئی بہت بڑا قصور کیا ہو۔

"خان! اس دفعہ تو میں صفیہ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ میں کامن ویلتھ کی دوڑوں سے گولڈ میڈل جیت کے لاؤں گا تو اس سے شادی کروں گا۔"

برسوں کے سمیٹے خواب یوں بکھر گئے جیسے عبداللہ یہ بھول ہی گیا ہو کہ اس نے انگریزی کی سرزمین پر جان کو شکست دے کر چار سو میٹر ہرڈلز کا گولڈ میڈل جیت لیا تھا۔ اور صفیہ...... جیسے یہ جانتی ہی نہ ہو کہ وہ ایک ایسے شخص کی رفیقۂ حیات ہے کہ جس کے پہلو میں

کھڑے ہو کر جے سی او ون نے بڑے فخر سے تصویر بنوائی تھی۔

ایک روز عبداللہ خان پاکستان کلر کا کوٹ پہنے بارش میں بھیگتا ہوا میرے گھر آیا...... شدید سردی تھی۔ رُوبی جلدی سے چائے لے آئی۔

''یار عبداللہ! تم اس بارش میں پاکستان کلر پہنے بھیگتے پھر رہے ہو۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ تو خاص خاص موقعوں پہ پہنا جاتا ہے۔ تم نے تو اسے رین کوٹ بنا رکھا ہے۔''

''خان میں نے مشقتوں کی ایک طویل دوڑ دوڑ کر یہ پاکستان کلر (Win) کیا ہے اور تم لوگ مجھے یہ اختیار بھی نہیں دیتے کہ میں اسے اپنی مرضی اور ضرورت سے پہن سکوں اور میرے پاس کوئی دوسرا کوٹ بھی تو نہیں ہے۔''

عبداللہ خان اندر اور باہر سے بھیگا ہوا تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ہاتھ دہکتے انگاروں میں جھونک دیا ہو۔

''میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ چھوٹا بچہ بہت بیمار ہے۔ ڈاکٹر نے ٹیکے لکھ دیے ہیں۔ تنخواہ تو ساری دوکان دار کے ہاں اُٹھ جاتی ہے۔ تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ...... عبداللہ خان اچانک خاموش ہو گیا یوں لگا جیسے بغیر وارم اَپ کے دوڑنے سے اچانک اس کا مسل Pull ہو گیا ہو۔ ماتمی بینڈ کی طرح اُس کے اندر بجتی ہوئی کھانسی رُک گئی۔ اس نے اپنی بولتی ہوئی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ خاموشی اور چُپ کا ایک مختصر مگر طویل وقفہ تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان کا معلق وقفہ۔ میں عبداللہ خان کو سنبھالنے لگا۔

''پریشان نہ ہو یار بچہ ٹھیک ہو جائے گا اور تمہیں جتنے بھی پیسے ضرورت ہیں لے لو۔''

حیرائی ہوئی آنکھوں سے عبداللہ نے مجھے دیکھا اور بھیگے ہوئے کوٹ کی اندر کی جیبوں سے نکال کر اس نے لفافے میں لپٹا گولڈ میڈل میز پہ رکھ دیا۔

''خان! یہ رکھ لو اور مجھے پیسے دے دو۔ میں نے آج تک کسی سے مانگ کر کبھی کچھ نہیں لیا۔ نہ یہ پاکستان کلر نہ یہ گولڈ میڈل۔ میری فوج کے افسروں نے جمعداری کی ترقی

کے لیے مجھ سے ایک درخواست مانگی تھی کہ جس میں مَیں اپنی سابقہ کارکردگی کا ذکر کروں۔ درخواست دے کر جمعداری لینے کی بجائے میں حوالداری پنشن آ گیا۔ خان! تم بھی اتھلیٹ رہے ہو۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ چار سو میٹر ہرڈلز ریس سٹارٹنگ لائن پہ آ کر ختم ہوتی ہے اور آج میں زندگی کے سارے ہرڈلز پھلانگنے کے بعد اُسی سٹارٹنگ لائن پہ آ گیا ہوں جب میں نے سکول میں اردو کی کتاب بیچ ڈالی تھی...... اپنا مستقبل بیچ ڈالا تھا۔ آج تو میں ہاری ہوئی زندگی کے لیے اپنی جیت بیچنے آیا ہوں۔ کبھی اس قابل ہوا تو تم سے یہ میڈل میں واپس لے لوں گا۔"

ماتمی بینڈ کی طرح بجتی ہوئی اُس کی کھانسی تیز ہو گئی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ پھر تیز کی آواز سے اُس نے فرش پہ تھوک دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی عبداللہ خان چار سو میٹر کی ہرڈلز ریس ختم کر کے آیا ہو۔

□□□

بازگشت

دھول اڑاتا ہوا ٹرک چوک سے بائیں ہاتھ مڑا اور ایک غلیظ سے ہوٹل کے سامنے رک گیا۔ گرد ٹھہری ٹھہری فضا میں تحلیل ہوتی چلی گئی...... دھول اور دھوئیں سے اٹی فضا ...... ہوا بند تھی۔ سردی تیز ہوتی گئی...... پیاسی دھرتی گرد اگلتی رہی جو اڑ کر درختوں کے نیم مردہ پتوں پہ یوں ٹکتی رہی جیسے شام کو دور جانے والے چڑیوں کے غول درختوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ کمبلوں، بوسیدہ کوٹوں اور میلی چادروں میں لپٹے لوگ تھکے تھکے قدموں سے دکانوں میں گھس جاتے۔ پوٹلیاں اور آٹے کے تھیلے اٹھائے چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے گھروں کو واپس چلے جاتے۔ سخت سردی کے باوجود بازار میں بیسیوں لوگ تھے۔ آج کارخانے سے انہیں تنخواہ ملی تھی۔ مگر ان میں کوئی جوش کوئی ولولہ نہ تھا۔ ایک سکوت سا تھا۔ شکست آلودہ سکوت۔ پھیکی پھیکی روشنی میں چمکتے ان کے پیلے چہروں پہ یاس بھری مسکراہٹیں تھیں۔ کرب سے بھرپور لہجے میں تلخیاں تھیں۔ ہاتھوں میں آٹے کے بیگ تھے ...... مہیب سناٹا تھا۔ کبھی کبھی مٹی کی ہانڈی میں سلگتے اپلوں کے دھوئیں میں سے خوانچے والے کی آواز ابھرتی۔ اور خاموش سناٹے میں ڈوب جاتی۔

"آ ختہ اے...... گرم اے...... چار آنے چھٹانک اے۔"

اس آواز کی بازگشت بازار کے ہر کونے سے سنائی دیتی۔ یہ بازگشت کیا ہے۔

آوازوں کی گونج ہے...... خوانچے والے کی آواز...... تانگے والے کی آواز......

فقیر اور فٹ پاتھ پر بغیر ٹانگوں کے ایک بچے کی آواز۔ ان سب آوازوں کی ایک ملی جلی بازگشت ہے۔ بازگشت تو ویرانوں میں گونجتی ہے۔ مگر یہ تو بھرے بازار میں سنائی دے رہی ہے۔ گرد اور دھوئیں سے اُلجھتی روشنیوں سے ابھر رہی ہے۔ قصائی کی دکان کے سامنے بیٹھے بیسیوں کتوں کی آواز۔ کتوں کا ایک ہجوم ہے۔ غراتے ہوئے کتے، موٹے، مریل، کالے، سفید اور ڈبے کتے، بوڑھے کتے، پلے۔ بچوں والی کتیاں، پٹے والے اور خارش زدہ کتے بھی۔ بازگشت کبھی کبھی دھوئیں بھرے ہوٹلوں کی ریکارڈنگ سے اُبھرتی ہے، تنگ گلی کی بوسیدہ دیواروں سے ٹکراتی ہے اور بکھر جاتی ہے۔ تنگ گلی، متعفن فضا، یہ گلی دن کے اُجالوں میں تاریک اور رات کی تاریکیوں میں روشن ہو جاتی ہے...... نکھر جاتی ہے۔ ان روشنیوں میں لوگ راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ آج میری مٹھی میں پیسے ہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ رات کو ان دریچوں میں کیا بجتا ہے...... جو دن کے اُجالے میں بند ہو جاتے ہیں۔ چک کے پیچھے ان روشنیوں میں جھانکا...... وہاں مجھے حوا نظر آئی...... آدم نظر آیا۔ قصائی کی دکان کے باہر بیٹھے کتوں کی طرح بھوکے انسان نظر آئے۔ میری مٹھی میں پیسے کم تھے۔ سیڑھیوں سے نیچے اُترا...... گلی میں آکر دریچوں سے بھی اوپر دیکھا۔ گرد اور دھوئیں کی لپیٹ میں نیلا آسمان...... بجلی کی بیسیوں تاریں اور ان تاروں سے اٹکی پھٹی پتنگیں...... دھاگوں سے لٹکتے لنگر...... نہ جانے ان تنگ گلیوں میں پتنگ اڑتی کیسے ہے۔ شاید جو پتنگ کٹ جاتی ہے وہ ان تنگ گلیوں کی تاروں میں اُلجھ جاتی ہے۔ ان دریچوں میں سج جاتی ہے۔ پھر مجھے پائل کی جھنکار اور طبلے کی لے پہ گھنگروؤں کی آواز سنائی دی۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ ان آوازوں کی بازگشت اب بھی میرا پیچھا کر رہی ہے۔ پیسے ابھی تک میری مٹھی میں دبے ہوئے ہیں۔ میں آج ایک بوتل کی تلاش میں بھی ہوں۔ تاکہ سارے مہینے کی تلخیوں اور نارسائیوں کا احساس اس بوتل میں تحلیل کر دوں۔ تازہ دم ہو جاؤں۔ پھر تلخیاں سمیٹوں۔ ہر شام اپنی مکروہ صورت بیوی کو پیٹوں۔ اس کے درجن بھر بچوں کے لیے دس دس سیر کے آٹے کے تھیلے لاؤں۔ چار آنے کا مٹی کا تیل۔ اور ادھار سبزی لاؤں...... کاش مجھے ہر روز ایک بوتل مل سکتی۔

گلی کے آخری کونے کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں جا بجا کوڑے کی ڈھیریاں سلگ رہی تھیں۔ متعفن دھواں پوری فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ کوڑے کے ڈرم کی اوٹ سے مجھے حرکت کرتا ہوا ایک وجود نظر آیا۔

''میرے خدا! وہ کتنا مریل تھا۔'' مجھے دیکھ کے وہ شرما گیا۔ اس نے اپنا منہ کھول دیا جیسے ابھی مجھے نگل کھائے گا۔ بغیر دانتوں کے اُس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ سردی سے وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ کمزور وجود...... اس کی پسلیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ چہرے پہ بھوک چپکی ہوئی تھی۔ میں اس کے اور قریب چلا گیا۔ وہ ٹپٹایا۔ بے چین ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ مگر شاید بھوک سے اس کی شرم مر گئی تھی۔ وہ ذرا بھی نہ جھجکا نہ شرمایا۔ کوڑے کے ڈرم کے سوراخ سے باہر نکلے گوشت کے ٹکڑے کو کھینچنے لگا۔ وہ کسی قصائی کا پھینکا ہوا ناقابلِ استعمال گوشت تھا۔ بہت سی چیزیں بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل استعمال ہوتی ہیں۔ مگر بہت سارے لوگ انہی چیزوں کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ وہ آج یہاں کیا کر رہا تھا۔ غلاظت اور کوڑے کے ڈرم سے اسے کیا ملے گا۔ وہ کسی نان بائی کی دکان پر جاتا، کسی ہوٹل میں جاتا۔ اگر گوشت ہی لینا تھا تو کسی قصائی سے مانگتا۔

''آ گرم اے...... خستہ اے...... چار آنے چھٹانک اے۔'' خوانچے والے کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد سنائی دیتی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ اس نے گوشت کے ٹکڑے کو ڈرم سے باہر کھینچنے کی جدوجہد تیز کر دی۔ میں اس کی بے بسی پہ مسکرا اٹھا اور گلی میں بائیں ہاتھ ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ پیسے ابھی تک میری مٹھی میں دبے ہوئے تھے۔

ہوٹل بھی دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ باورچی خانے کا دھواں، سگریٹوں کا دھواں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ریکارڈنگ پورے زور و شور سے ہو رہی تھی۔ ہوٹل کا بیرا ایک چھوٹا سا لڑکا ہر ریکارڈ کے ساتھ باقاعدگی سے گاتا۔ گانا ختم ہوتا تو بیرے کی آواز ایک بازگشت کی آواز کی طرح سنائی دیتی۔ ''صاحب آپ کے لیے ڈبل چائے لاؤں یا سنگل۔''

کتنی معصومیت تھی اس کی آواز میں۔ ورنہ بازار کے ہر سودے میں بازاری پن

پایا جاتا ہے۔ بیرے کی معصوم سی صورت میری آنکھوں میں دھندلا گئی۔ ننھے جیمس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ کاش یہ بیرا میرا بیٹا ہوتا۔ میں اسے کانونٹ میں پڑھاتا۔ یہ ایک سمارٹ لڑکا ہوتا۔ مگر کانونٹ جا کر اس کی معصومیت تحلیل کے رہ جاتی۔ اس کی معصومیت، اس کا بھولا پن اس کی بیرا گیری میں پایا جاتا ہے۔ ''صاحب کچھ اور بھی لاؤں'' اس کے پوچھنے کے انداز میں کتنا بھولپن پایا جاتا ہے۔ نہیں نہیں اسے بیرا ہی رہنا چاہیے ورنہ وہ اپنی معصومیت کھو دے گا۔ میں بھی کتنا ذلیل ہوں...... کس سطحی انداز میں سوچتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ بیرا زندگی بھر ہوٹلوں کی ٹپ پہ پلتا رہے۔ اس کی خودداری چائے میں چینی کی طرح تحلیل ہوتی رہے۔ اس کا مستقبل ٹب میں کھنکتی پیالیوں کے دھونے میں بہہ جائے۔ مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میرا ننھا جیمس خود چرچ کے امدادی سکول میں پڑھ رہا ہے۔ میں وہاں سے اٹھا۔ وہ بیرا مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ جیسے اس نے میرے اندر ایک تڑپتے اور سلگتے انسان کو دیکھ لیا ہو۔ وہ زور سے چلایا ''تین آنے'' اور جھاڑن سے میز صاف کرنے لگا۔

میں گلی میں آگے بڑھ گیا۔ اجمل کی بھٹی میں دیا روشن تھا۔ اجمل کہتا تھا کہ اس بھٹی چڑھ کر پیتل بھی کندن ہو جاتا ہے۔ میں نے اُس روز خوب پی۔ میری مٹھی خالی ہو گئی۔ کچھ ادھار بھی پی۔ اجمل نے مجھے گالیاں دیں اور ان گالیوں کی بازگشت میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں وہاں سے اُٹھا۔ پیلی روشنیاں جانے اندھیروں میں کہاں گم ہو گئی تھیں۔ گلی پار کر کے میں میدان میں آ گیا۔ کوڑے کی کچھ ڈھیریاں ابھی تک سلگ رہی تھیں۔ کچھ جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ کوڑے کے ڈرم کے پاس وہی سایا ابھی تک حرکت کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک گوشت کے ٹکڑے سے اُلجھا ہوا تھا۔ اسے بمشکل بالشت بھر باہر کھینچ پایا تھا۔ جانے کب کا سوکھا ہوا گوشت تھا۔ اس کے دانت بھی نہ تھے ورنہ باہر نکلے گوشت کو دانتوں سے ہی کاٹ لیتا۔ بوڑھا کمزور اور مریل جسم۔ بھوک اس کے پچکے پیٹ سے نمایاں تھی اور اس کے لیے ایک بھیانک جنون بن گئی تھی۔ ایک جنون جو گوشت کے ٹکڑے سے اُلجھ رہا تھا۔ میں نشے میں چُور یہ تماشا دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ انسان بھوک سے بہک جاتا ہے یا نشے سے۔ ان

گلیوں سے تو میں روز گزرا کرتا تھا۔ اس وقت میرے ذہن پہ منوں بوجھ ہوا کرتا تھا۔ ذمہ داریوں کا بوجھ ...... ضرورتوں کا بوجھ۔ میں گلی میں بڑھتا چلا جاتا۔ قدم خود بہ خود اٹھتے رہتے۔ یہ قدم ان گلیوں کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھے۔ پہلے میرا ذہن پریشانیوں میں الجھا ہوتا۔ آج تو میرے قدم بھی بہکے ہوئے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ جیسے یہ گلی میرے لیے انجانی ہو۔ راہیں نئی ہوں۔ پہلے کی طرح آج میرے ذہن پہ کوئی بوجھ نہ تھا۔ ذمہ داریوں کے احساس کا مَیل تو میں اجمل کی بھٹی میں چھوڑ آیا تھا۔ وہاں سے کندن بن کر نکلا تھا۔ کھلے ذہن پہ صرف ایک ہی دھبہ تھا۔ جلتا ہوا دھبہ جو نشے میں بھی سلگ رہا تھا۔ گوشت کی طرح جل رہا تھا۔ سڑاند دماغ کو ماؤف کیے دے رہی تھی۔ راہ چلتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ پھر اندھیرے کے پیچھے سے ایک عکس ابھرتا۔ کوڑے کے ڈرم کے سوراخ سے باہر لٹکے سوکھے گوشت کا عکس ...... اور اس سے الجھا ایک مریل جسم۔ بھوکے کی کائنات کتنی محدود اور تنگ ہوتی ہے۔ سوراخ کی طرح تنگ جس میں خوراک کا ٹکڑا اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ یہ زیست کیا ہے۔ کبھی اتنی محدود ہو کر ایک کوڑے کے ڈرم میں سما جاتی ہے ...... اور کبھی بلند محلوں پہ بھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔ میں بھٹکتا چلا گیا۔ بلند محل ...... ہمارا ان سے کیا تعلق۔ تعلق تو ہے مگر اس وقت تک رہتا ہے جب تک ان کی حیثیت اینٹ گارے تک محدود ہوتی ہے مگر جب یہ محل تیار ہو جاتا ہے تو ہم جیسے امارت کے ان پردوں کے پیچھے جھانکنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے۔ مگر پھر بھی ہمارا ان سے ایک تعلق رہتا ہے۔ جب ایک عمارت بنتی ہے تو ہم آنے کے بیسیوں تھیلے خرید کر لاتے ہیں۔ ایک محل بنتا ہے تو بیسیوں جھونپڑیاں آباد ہو جاتی ہیں۔ میں آج نشے میں کتنا بہک گیا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں سے بڑھتا چلا گیا۔ گلی بدستور تاریک تھی۔ بادلوں کے دریچوں سے جھانک کر چاند مجھے گھورتا رہا۔ چاندنی منڈیروں پہ بیٹھی مجھے تاریک گلیوں میں تلاشتی رہی ...... کہیں نہ پا سکی۔ کبھی کبھی تو میں اپنے آپ کو بھی نہیں پا سکتا۔ آج واقعی میں کہیں کھو گیا تھا۔ جانے کہاں۔ اجمل کی بھٹی میں یا کوڑے کے ڈرم کے آس پاس۔ راستے وہی تھے ...... گلیاں وہی تھیں ...... البتہ میری سوچیں کہیں کھو

گئی تھیں۔ مریل جسم بھوک سے پچکا ہوا پیٹ، اور کوڑے کے ڈرم کے سوراخ میں اٹکا گوشت کا ٹکڑا۔ گھر آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ سر پہ میلی پٹی باندھے میری بیوی بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ تو کوئی پیدائشی درد سر تھی۔ وہ میری طرح کیوں نہیں سوچ رہی تھی۔ مگر میں تو نشے میں تھا...... سو گیا...... خوابوں کی دُنیا میں کھو گیا۔ جیسے انٹرول کے بعد فلم دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ خوابوں کی دُنیا بھی تو شعور کی دنیا کا ایک طلسماتی روپ ہوتی ہے۔ انسان تو بند اور کھلی آنکھوں سے ہر وقت جاگتا رہتا ہے۔ نیند تو صرف ایک حد ہے...... حقیقت اور خواب کی دنیا کی۔

اجمل کی بھٹی بہت بڑا کارخانہ بن گئی۔ جہاں ڈرموں شراب کشید ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ڈرم بھی بنتے ہیں۔ کوڑے کے ڈرم۔ مگر ان میں کوڑے کی بجائے تازہ تازہ گوشت تھا۔ مجھے اس مُریل جسم کی تلاش تھی۔ جانے وہ کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ ڈرموں سے شراب باہر بہہ نکلی۔ پھر خون بہہ نکلا اور اس نے ایک خوف ناک دریا کا روپ دھار لیا۔ میں اس دریا میں ڈوب گیا...... بہہ گیا...... کنارے لگ گیا۔ کنارے پہ مجھے خون میں لتھڑی اس مریل جسم کی لاش ملی اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں کھولا۔ ہڈیوں کے چند ٹکڑے تھے۔ اس بھیانک خواب سے میں جاگ اٹھا۔ شکر ہے آج سنڈے تھا۔ ورنہ اتنے بھیانک خواب دیکھ کر میں اکثر ڈیوٹی سے غیر حاضر ہو جاتا ہوں۔

صبح بازار سے سودا خریدنے گیا۔ ہم لوگ ایک ایک چیز بازار سے خرید کر لاتے ہیں۔ یک مشت خریداری کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ میدان سے گزرا۔ کوڑے کے ڈرم میں سے گوشت کا ٹکڑا اٹک رہا تھا۔ اور وہ مریل جسم ڈرم کے پاس بے سدھ لیٹا ہوا تھا یا شاید مر گیا تھا۔ میں نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی دھڑکنیں بدستور تھیں۔ وہ چونک کر اٹھا۔ لڑکھڑایا۔ گر گیا۔ پھر وہ تیزی سے اٹھا اور گوشت کی طرف لپکا۔

سودا لے کر گھر واپس آیا۔ گرجے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ نہا کر صاف کپڑے پہنے اور چرچ چلا گیا۔

''یسوع زندگی ہے...... یسوع کائنات ہے...... یسوع خالق ہے، مالک ہے۔''

میں سوچ رہا تھا کہ ابھی جا کر اس مریل جسم کو بتاؤں گا کہ سب کچھ یسوع ہے جس سے تم اُلجھ رہے ہو یہ محض ایک کوڑے کا ڈرم ہے جس کے سوراخ میں ایک سوکھا ٹکڑا اٹکا ہوا ہے۔ چرچ سے واپسی پر میدان سے گزرا۔ ڈرم کے پاس دھول میں سے کارپوریشن کا ٹرک نمودار ہوا۔ میلے میلے چار آدمی ٹرک سے اُترے۔ ڈرم کو اُٹھایا اور کوڑے کو ٹرک میں ڈال دیا۔ گوشت کا ٹکڑا بیسیوں من کوڑے کے نیچے دب گیا۔ مریل جسم نے کوڑے کے خالی ڈرم کا ایک چکر لگایا اور سوراخ میں گوشت کا ایک ٹکڑا نہ پا کر پاس پڑی ہڈیوں کو چٹخانے لگا۔ وہ تو کُتا تھا۔ انسان ہوتا تو کسی کا خون کر دیتا۔ ایک بازگشت اب بھی میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

''یسوع زندگی ہے...... یسوع کائنات ہے...... یسوع خالق اور رازق ہے۔''

□□□

26.7.08

عزیزی امان اللہ خان

السلام علیکم

سلامت رہو خوش رہو

تم ایسی کہانیاں لکھتے ہو جن جیسی کوئی ہر جملہ مشکل
سے سمجھ سکتا ہے دوا ہی یا ڈگری یافتہ عالی ہوتی کا صاحب
طالب علم

تم میرے تمام جو اشتہیم ایک بڑے ادیب
کے ضمن۔ یہ اور بات ہے کہ شہرت تمہاری دہلیز
کی باندی ہے یا دور دور۔ مجھے جو اللہ تعالیٰ سے میری
آرزو ہے کہ تم اپنی خواہش کے مطابق درخشاں
مستقبل حاصل کر سکو ——— آمین

دعا سے

دعا گو
بانو قدسیہ
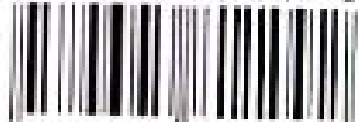
"بے خواب سفر" کے تمام افسانے روح میں جذب کر لینے کے بعد سکتے کی کیفیت میں ہوں۔ سرشاری، مسرت اور روحانی کیف کو الفاظ کا پیرہن دینا جتنا میں سہل جانتا تھا، اتنا ہے نہیں......!

مروجہ اوق تنقیدی جملوں اور رائج نقادی الفاظ کی کال کوٹھری میں افسانوں کو بند کرنا ظلم ہے۔ یقین کیجیے ہر افسانہ تتلی ایسا ہے، خوش نما، خوش رنگ، دل آویز، دل پذیر......!

امان اللہ خان کے افسانوں کا تعلق ایسی سحر انگیز سرزمین سے ہے جو قاری کو باطنی کیف سے مالا مال اور سرشار کرتی ہے۔ ہر افسانہ قاری کے وجود میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ میری اس بات کی گواہی افسانے کا ہر سنجیدہ قاری دے گا۔ روانی، سلاست، بیانیہ، وحدت تاثر، زبان برتنے کا سلیقہ، ایسی تشبیہات اور استعارے امان اللہ خان کے افسانوں کے احاطہ کے لیے مجھے کم پڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ میری کتھا چھوڑیے، آپ افسانے پڑھنا شروع کیجیے......!

محمد حامد سراج